# قرءان مجید تفسیر حقیقت اور بیان حقیقت ہے

تشریح وتوضیح اکیڈیمک اصولوں کے تحت۔

## سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِـی ۔ سُورَةُ الفَاتِحَة

2022

مؤلف: مظہر انوار نورانی

معاون: ثریا نورانی

## تعارف اور انفرادیت

اللہ تعالیٰ نے آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کو جس انداز میں اپنے کلام کو ترتیب دے کر عطا فرمایا تھا، اس کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَلَقَدۡ ءَاتَيۡنَٰكَ سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِى

اور یہ حقیقت ہے کہ ہم جناب نے آپ (ﷺ) کو پنہاں کو ظاہر کے روبرو کرتے/متناظر مجموعہ [Binary/Symmetrical-analogous] میں سے منتخب فرمائی ہوئی سات صریحاً واضح آیات عنایت فرمائی/پہنچائی ہیں۔

وَٱلۡقُرۡءَانَ ٱلۡعَظِيمَ ۝٨٧

اور ہم جناب نے آپ (ﷺ) کو قرءانِ عظیم عنایت فرمایا/پہنچایا ہے۔ (سورۃ الحجر۔۸۷)

آیت مبارکہ کا یہ جملہ ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے ایک مرکب جملہ/compound sentence ہے۔ یعنی دو جملوں کا آمیزہ ہے۔ ایسے جملے میں الفاظ میں کفایت/economy کے ساتھ ساتھ تحریر میں حسن پیدا ہوتا ہے، اور دو مختلف باتوں کے مابین یکساں پہلو اور کچھ نسبت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اور معنی کے لحاظ سے یہ جملہ declarative sentence ہے جسے آپ اردو میں اعلانیہ، اطلاعی، معلوماتی جملہ کہیں گے۔ ایسے جملے کا مقصد مخاطب اور قاری کو معلومات دینا ہوتا ہے، بحث مباحثہ اور نکتے کو منوانا مقصد نہیں ہوتا۔

اس جملے میں دو مختلف عنایات کا ذکر ہے۔ ءَاتَيۡنَٰكَ بناوٹ میں ایک لفظ دکھائی دیتا ہے مگر تین الفاظ پر مشتمل ہے، فعل ماضی، ''نا'' ضمیر متکلم جمع فاعل کی ہے، اللہ تعالیٰ شاہانہ انداز میں بیان فرما رہے ہیں اور "کَ" واحد مذکر مخاطب کی ضمیر اول مفعول بہ ہے، آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ جنہیں متذکرہ چیز پہنچائی گئی تھی۔ فعل ماضی، باب افعال سے ہے جس کے معنی کسی کو کوئی شئے پہنچانا، عنایت کرنا ہے اور جو چیز پہنچائی گئی تھی وہ فعل ماضی کا دوسرا مفعول بہ ہے، اور وہ ہے سَبۡعًا جس کے معنی کوئی سات مونث اشیاء ہیں جو آیت مبارکہ میں بظاہر لفظاً لکھی دکھائی نہیں دیتیں۔ عربی زبان کا اصول ہے کہ اختصار اور حسنِ بیان کے لئے الفاظ کو حذف صرف اس صورت میں کیا جائے گا جب عربی تحریر کو سمجھنے والے قاری کے لئے واضح اشارہ موجود ہو اور وہ باآسانی اور روانی میں اس محذوف لفظ کو پہچان لے۔

اصولی طور پر ترجمہ کرتے ہوئے محذوف الفاظ کو ترجمے میں شامل کرنا ازحد ضروری ہے۔ وگرنہ عربی زبان سے نابلد شخص کے لئے ترجمے میں سقم اور ابہام ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ انگلش کے پہلے مشہور ترجمے سے لے کر جتنے اردو ترجمے موجود ہیں ان تمام میں آیت مبارکہ میں لفظ سبعًا کے بعد محذوف لفظ کا ترجمہ ''آیتیں'' موجود پاتے ہیں۔ دو مثالیں:

George Sale

We have already brought unto thee seven verses which are frequently to be repeated, and the glorious Koran

جناب طاہر القادری صاحب: ''اور بیشک ہم نے آپ کو بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں (یعنی سورۃ فاتحہ) اور بڑی عظمت والا قرءانِ عطا فرمایا ہے''

آیت مبارکہ میں لفظ کے محذوف ہونے کا اشارہ لفظ ''سَبعًا'' کی تنوین میں موجود ہے۔ یہ تنوین اُس لفظ کے عوض ہے جو محذوف ہے۔ اگر اس کے بعد کے لفظ کو حذف نہ

کیاہوتاتو یہ لفظ سَبعًا کی بجائے سَبعَ ہوتا ۔ یہ لفظ ہمیشہ مرکب اضافی کی صورت ہوتا ہے اور دوسرا جزو یعنی مضاف الیہ جمع مونث ہو گا۔ عدد اور معدود یعنی جس شئے کی تعداد بیان کی جارہی ہے اکٹھے ہوتے ہیں:

وَلَقَدۡ ءَاتَيۡنَا مُوسَىٰ تِسۡعَ ءَايَٰتِۭ بَيِّنَٰتٖۖ

تاریخ سے آگاہ رہو؛ ہم جناب نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو عدد آیات عنایت کی تھیں جو اپنے آپ میں حقیقت کی جانب رہنمائی کرنے والے بے نظیر مشاہدات پر مبنی تھیں ۔(حوالہ الاسراء۔۱۰۱)

''سَبعَ'' کی طرح ''تِسۡعَ'' بھی موث معدود کی تعداد نو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ یہاں معدود، لفظاً موجود ہے اس لئے اس پر تنوین نہیں ہے۔ ''سَبۡعًا'' کی تنوین نے ظاہر کیا کہ یہ مرکب اضافی ''سَبعَ ءَايَٰتٍ'' ہے یعنی سات آیات ہیں۔

آپ دو بیان کردہ تراجم میں ان سات آیتوں کا وصف بھی لکھا دیکھ رہے ہیں، frequently to be repeated، بار بار دہرائی جانے والی، مگر ان الفاظ کو بیان کرنے والے عربی کے الفاظ آیت مبارکہ میں موجود نہیں۔ اور نہ قرءانِ مجید میں کہیں بھی آیتوں کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے۔ قرءانِ مجید کی آیات کا وصف جو بیان کیا گیا ہے وہ ''بَيِّنَٰتٍ'' اور ''مُّبَيِّنَٰتٍ'' ہے یعنی صریحاً واضح اور ہر بات کو متمیز اور نمایاں کر دینے والی ہیں۔

وَلَقَدۡ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ءَايَٰتِۭ بَيِّنَٰتٖۖ

اور ہم جناب نے آپ (ﷺ) کی جانب یقیناً مجتمع انداز میں معنی و مفہوم میں واضح آیتیں نازل فرمادی ہیں۔ (حوالہ البقرۃ۔۹۹)

---

وَلَقَدۡ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكُمۡ ءَايَٰتٖ مُّبَيِّنَٰتٖ

اور ہم جناب نے تم لوگوں کی جانب مجتمع انداز میں ہر بات کو نکھار کر واضح کر دینے والی آیتیں نازل فرمادی ہیں۔ (حوالہ النور۔۳۴)

آیت مبارکہ کے پہلے جملے میں محذوف لفظ ''ءَايَٰتٍ'' کا وصف بھی محذوف ہے جس کا اظہار مرکب، جار و مجرور ''مِّنَ ٱلۡمَثَانِي'' سے ہوتا ہے جو آیات کے وصف کے متعلق ہے۔ اس مرکب کے معنی ہیں ''المثانی/ مجموعہ میں سے''۔ جن دو تراجم کا ہم نے حوالہ دیا ہے ان میں اس مرکب، جار و مجرور کا ترجمہ بیان نہیں ہوا۔

حرف ''مِّنَ'' کے معنی کل میں سے بعض ہیں (اسے تبعیض کہتے ہیں)۔ یہاں حرف ''مِن'' کے معنی ''کل میں سے بعض'' کے علاوہ نہیں ہو سکتے کیونکہ اِس سے قبل اسم عدد (سَبعًا) موجود ہے۔ قرءان مجید آیات کا مجموعہ ہے۔ قرءانِ عظیم کیلئے صیغہ ہمیشہ مذکر اور سورتوں اور آیات کیلئے صیغہ مؤنث استعمال ہوتا ہے۔

''ٱلۡمَثَانِي'': (معرفہ جمع مکسر مجرور، مؤنث۔ واحد مثنیٰ) کا ماخذ "ث ن ی" ہے جس میں سمو یا بنیادی تصور کسی شئے (جیسے کپڑا، چادر) کو دہرا کرنا یا تہہ کرنا، یا کسی چیز (جیسے درخت کی شاخ) کو موڑ کر دہرا کرنا، کسی شئے کی ایک حد/کنارے کو موڑ کر اُس کے دوسرے کنارے سے باہم گرملانا ہے۔ یہ دہرے/folding کئے جانے کے مقام کی بھی نشاندہی [signifiy] کرتا ہے۔

جب ہم کسی شئے کو دہرا/fold کرتے ہیں تو اُس کے دونوں حصے ایک دوسرے کے روبرو/confronting ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کا عکس بنتے اور ایک دوسرے کو منعکس/mirror کرتے ہیں۔

اِس میں چیز کے حصوں کے تہہ بر تہہ/layers یا۔ ایک دوسرے کے ساتھ متصل انداز یعنی بصورت مجموعہ/bundle کے موجود ہونے کا تصور موجود ہے۔

استثناء کے معنی ہیں کسی کو مستثنیٰ کرنا (set aside as exluded, excerpted)، الگ نکال کر رکھ دینا، چھانٹ لینا۔ الاثنان۔ دو، ایک کا دگنا۔

اِس طرح اِن تین الفاظ کے معنی کی روشنی میں۔سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِی کے معنی اور مفہوم یہ ہیں ''پنہاں کو ظاہر کے روبرو کرتے/متناظر مجموعہ میں سے منتخب فرمائی ہوئی سات صریحاً واضح آیات''۔

سورۃ الفاتحہ پنہاں کو ظاہر کے روبرو کرتے/متناظر مجموعہ '' ٱلۡمَثَانِی'' میں سے منتخب فرمائی ہوئی سات آیات پر مشتمل ہے۔

سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِی۔اللہ تعالیٰ کے کلام کا ابتدائی حصہ،اول سورۃ ہے جس کا نام الفاتحہ ہے اور ایک دوسرا نام الحمد بھی ہے۔اِس میں سات (سَبعًا) آیتیں ہیں اور اِس کے بعد قرءانِ مجید کی ایک سو تیرہ سورتیں ہیں جن میں چھ ہزار دو سو انتیس آیات مبارکہ ہیں۔

سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِی اور قرءانِ عظیم مجموعی طور پر ایک سو چودہ سورتیں بن جاتی ہیں جو ستاون کا دگنا ہے۔اور دونوں کی آیات کا مجموعہ چھ ہزار دو سو چھتیس بنتا ہے۔اگر سورتوں یا آیات مبارکہ کی گنتی کی تعداد طاق ہوتی تو لفظ ٱلۡمَثَانِی میں پنہاں تصور مجروح ہوتا کیونکہ طاق تعداد کسی کا دہرا،دگنا نہیں ہوتی۔اور یہ بھی یاد رہے کہ جفت ہمیشہ طاق ہی سے بنایا جاتا ہے چاہے انسان ہو (نفس واحدہ،اور پھر اُس ایک نفس میں سے عورت کی تخلیق،زوج،جفت بنا دیا) یا اعداد کی گنتی۔

سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِی۔میں لفظ سَبعًا مؤنث اشیاء کی تعداد سات ہونے کا اظہار کرتا ہے۔اور یہ ماقبل متعدی فعل کا دوسرا مفعول بہ ہے جس کی وجہ سے منصوب ہے اور تنوین مضاف الیہ کے محذوف ہونے کی نشاندہی کرتی ہے جو اسم عدد کے مؤنث اشیاء سے متعلق ہونے سے قاری اور سامع کیلئے بالکل واضح ہے۔قرءانِ عظیم کیلئے صیغہ ہمیشہ مذکر اور اِس کی سورتوں اور آیات کیلئے صیغہ مؤنث استعمال ہوتا ہے۔

مِّنَ ٱلۡمَثَانِی۔جار و مجرور ما قبل مفعول بہ کی محذوف صفت سے متعلق ہے۔حرف-مِّنَ کے معنی کل میں سے بعض ہیں (اسے تبعیض کہتے ہیں)۔یہاں حرف ''من'' کے معنی ''کل میں سے بعض '' (تبعیض) کے علاوہ نہیں ہو سکتے کیونکہ اِس سے قبل اسم عدد (سَبعًا) موجود ہے۔

اِس طرح اِن تین الفاظ کے معنی کی روشنی میں۔سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِی۔کے معنی اور مفہوم یہ ہیں ''پنہاں کو ظاہر کے روبرو کرتے/متناظر مجموعہ میں سے منتخب فرمائی ہوئی سات صریحاً واضح آیات''۔

سورۃ الفاتحہ پنہاں کو ظاہر کے روبرو کرتے/متناظر مجموعہ میں سے منتخب فرمائی ہوئی سات آیات پر مشتمل ہے۔

اور جملے کے دوسرے حصے میں قرءانِ عظیم کو عنایت کرنے اور پہنچانے کا الگ سے ذکر ہے۔اس طرح واضح ہے کہ یہ دو عنایات ایک دوسرے سے متمیز اور منفرد ہیں مگر باہم گر،ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔قرءانِ مجید کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَقُرۡءَانًا فَرَقۡنَٰهُ لِتَقۡرَأَهُۥ عَلَى ٱلنَّاسِ عَلَىٰ مُكۡثٍ

اور ہم جناب نے قرءان کو الگ الگ حصوں (سورتوں/آیتوں) میں منقسم کیا ہے،اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ (ﷺ) توقف توقف سے تدوین و ترتیل فرما کو لوگوں کو سنائیں۔

وَنَزَّلۡنَٰهُ تَنزِيلًا ١٠٦

اور لوگ جان لیں کہ ہم نے اِسے بتدریج/وقفے وقفے سے (آیتوں/سورتوں میں) نازل کیا ہے۔(الاسراء۔١٠٦)

قرءانِ مجید سورتوں کی صورت میں الگ الگ کیا گیا ہے اور سورتیں آیات پر مشتمل ہیں۔ارشاد فرمایا:

ایک سورۃ جسے ہم جناب نے مجتمع حالت میں نازل کیا ہے۔اور اِسے ہم نے معین و مقرر (ہمیشہ کیلئے) کر دیا ہے۔

وَأَنزَلۡنَا فِيهَآ ايَٰتِۭ بَيِّنَٰتٍ

اور ہم جناب نے اِس سورۃ میں مجتمع انداز میں آیات نازل کی ہیں واضح اور متمیز کر دینے والی

لَّعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُونَ ۝١

تاکہ تم لوگ از خود یاداشت میں تسلسل سے محفوظ رکھ سکو/نصیحت لے سکو۔"(النور۔۱)

قرءانِ مجید کی "سپاروں" اور سورتوں کی "رکوعوں" میں تقسیم بعض لوگوں نے اپنے تئیں تلاوت کی سہولت اور حساب کیلئے کی تھی۔اللہ تعالیٰ کا قرءانِ مجید کے متعلق یہ معلوماتی جملہ "قُرۡءَانًا فَرَقۡنَٰهُ" صرف ایک بار بیان ہوا ہے:"اور ہم جناب نے اِس قرءانِ کو سر میں مانگ [الۡفَرۡقُ] کی مانند منقسم کر دیا ہے"۔اور فعل ماضی معلوم۔فَرَقۡنَا۔دو بار ہے،ایک مرتبہ یہاں اور اِس سے قبل سورۃ البقرۃ کی آیت ۵۰ میں جہاں خلیج سویز کو، بڑی بڑی ہڈی نما ٹکڑوں کے سطح سمندر پر ابھارنے سے ایک سر کی مانگ کی مانند خشک راستے کے ذریعے، دو حصوں میں منقسم کر دیا تھا۔اِس فعل کا مصدر "فَرۡقٌ" ہے اور مادہ "ف۔ر۔ق"۔الۡفَرۡق سر کی مانگ کو کہتے ہیں جو دائیں اور بائیں جانب کے بالوں کو ایک دوسرے سے متمیز اور نمایاں کر دیتی ہے۔قرءانِ مجید کے متعلق فرمایا کہ یہ ٱلۡفُرۡقَانَ ہے (حوالہ البقرۃ۔۱۸۵) یہ بھی مصدر ہے جو فعل اور حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ایک ایسا پیمانہ، کسوٹی اور جانچ جو دو اشیاء/باتوں/تصورات کو ایک دوسرے سے متمیز اور ممتاز کر کے اِس انداز میں اجاگر اور نمایاں کر دے کہ اُن میں سے کسی ایک کے متعلق بھی التباس کا امکان نہ رہے۔

سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِي یعنی سورۃ الفاتحہ اور عظیم قرءانِ کی ایک سو تیرہ سورتوں کی آیات میں واضح فرق یہ ہے کہ اِس سورۃ کے الفاظ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ایک انسان کہتا ہے اگرچہ اُس کے اپنے چنے اور مرتب کئے ہوئے یہ کلمات نہیں ہیں۔یہ اللہ تعالیٰ کے مرتب کئے ہوئے ہیں مگر ان سے قبل لفظ "قُل" (آپ، تو، تم کہہ، کہو) نہیں ہے جبکہ قرءانِ عظیم کی ایک سو تیرہ سورتوں میں رسول کریم ﷺ اور دوسرے لوگوں سے اللہ تعالیٰ سے یا دوسرے انسانوں سے مخاطب ہو کر جب بھی کوئی بات کہنی یا بتائی جانی ہو تو اِس سے قبل لفظ "قُل" آیا ہے۔حب کوئی بھی شخص کسی دوسرے سے مخاطب ہو کر کچھ کہتا ہے تو یہ قول کہلاتا ہے۔رسولِ کریم ﷺ جب لوگوں سے مخاطب ہو کر کوئی بات فرماتے ہیں تو یہ قولِ رسول کریم ﷺ کہلائے گا۔لیکن لفظ "قُل" واضح کر دیتا ہے کہ قولِ رسول کریم ﷺ میں جو بات (حدیث) کہی گئی ہے وہ بات (حدیث) آپ ﷺ کی اپنی نہیں ہے بلکہ حدیث اللہ ہے۔قول سے قبل حدیث موجود ہوتی ہے کیونکہ قول میں حدیث بیان ہوتی ہے۔قرءانِ عظیم غیر مسلموں کو سنانے کیلئے اور اُس پر ایمان لانے والے مسلموں کے پڑھنے کیلئے۔سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِي۔ہے اور اُن کیلئے قرءانِ عظیم زمان و مکان کے لمحات میں ھادی، رہنما ہے کہ ہر لمحے اور ہر قسم کے حالات اور مسائل میں عمل اور اتباع کیلئے اُس سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔

اس کا متن حیران کن کہ متکلم مصنف نہیں بلکہ متکلم ہم ہیں۔ایسے جیسے عام کتابوں میں پیش لفظ ہوتا ہے جو کوئی صاحب علم تصنیف کا مطالعہ کر لینے کے بعد مصنف کی شان میں کچھ لکھتا ہے اور مصنف اپنی کتاب کو پبلشر سے پبلش کرواتے ہوئے ابتدا میں اسے شامل کر دیتا ہے۔پیش لفظ میں مصنف اور پیش لفظ تحریر کرنے والے کے درمیان رابطے اور کتاب کے متعلق بات چیت کو لکھا جاتا ہے۔

سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِي صرف اُن لوگوں کیلئے ہے جو اللہ تعالیٰ، رسول کریم ﷺ اور قرءانِ عظیم پر ایمان رکھتے اور لے آتے ہیں یہ غیر مسلموں کیلئے نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرءانِ عظیم کی ایک سو تیرہ سورتوں کی چھ ہزار دو سو انتیس آیات (ٱلۡمَثَانِي) کے مواد میں سے چھانٹ کر، الگ کر کے سات آیات پر مشتمل ایک سورۃ اِس انداز میں مرتب کر کے عطا کی ہے کہ اِن آیات کے الفاظ وہ ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ، رسول کریم ﷺ اور قرءانِ عظیم پر ایمان لانے والوں کیلئے ہیں۔
اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اُنہوں نے ہمیں وہ کلمات بھی مرتب کر کے دیئے ہیں جن الفاظ میں اُن سے ہم نے مخاطب ہونا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ہماری پہلی بھول پر بھی اظہار ندامت کیلئے کلمات ہمیں سکھائے تھے:

فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن رَّبِّهِۦ كَلِمَٰتٍ

احساس ندامت سے مغلوب ہو جانے پر آدم (علیہ السلام) نے چند کلمات کا توجہ سے مشاہدہ کر کے اظہار ندامت اور عرضِ مدعا کیلئے پڑھ کر ازبر کر لئے جنہیں ان کے رب کی جانب سے تحریراً دکھایا گیا تھا۔

فَتَابَ عَلَيْهِۚ

طلب گار معافی ہونے پر اُن جناب نے اُن (آدم) کی معذرت کو قبول فرمالیا۔

إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ٣٧

یہ حقیقت ہے کہ وہ جناب اکثر و بیشتر توبہ قبول فرمانے والے ہیں، وہ منبع رحمت ہیں۔[البقرۃ۔۳۷]

قرءان عظیم کے متن کے یکتا اور منفرد ہونے کے متعلق مزید واضح فرمایا:

ٱللَّهُ نَزَّلَ أَحۡسَنَ ٱلۡحَدِيثِ

اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ اور کامل ترین کلام (قرءانِ عظیم) کو سلسلہ وار، یکے بعد دیگرے نازل فرمایا ہے، [لوگوں تک پہنچایا ہے]

كِتَٰبٗا مُّتَشَٰبِهٗا مَّثَانِيَ

بحیثیت ایک کتاب، تشبیہات سے پنہاں کو عیاں کر دینے کی خصوصیت سے مزین، متناظر مجموعہ کی صورت میں۔

كِتَٰبٗا مُّتَشَٰبِهٗا مَّثَانِيَ۔ کے معنی و مفہوم یوں واضح فرمائے:

تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُودُ ٱلَّذِينَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ

اِس کلام کے بعض حصوں سے اُن لوگوں کی جلد کپکپانے اور لرزنے لگتی ہے جو اپنے رب سے سراسیمہ رہتے ہیں۔

ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمۡ

بعد ازاں اُن لوگوں کی جلد نرم و ملائم ہو جاتی ہے۔

وَقُلُوبُهُمۡ إِلَىٰ ذِكۡرِ ٱللَّهِۚ

مزید برآں اُن لوگوں کے قلوب اللہ تعالیٰ کے ''ذکر'' (قرءان مجید کے بیان) کی جانب خشوع و اخلاص سے متوجہ رہتے ہیں۔

ذَٰلِكَ هُدَى ٱللَّهِ

یہ (قرءان عظیم) اللہ تعالیٰ کا فرمان ہدایت ہے۔

يَهۡدِي بِهِۦ مَن يَشَآءُۚ

وہ جناب اِس کے ذریعے ہر کسی طلبگار ہدایت کو ہدایت فرما دیتے ہیں۔(حوالہ الزمر۔۲۳)

قرءانِ مجید کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ مَّثَانِيَ (جمع مکسر، منصوب، مؤنث۔ واحد مثنیٰ) ہے جس سے ایک متناظر مجموعہ کا اظہار ہوتا ہے۔ قرءانِ مجید کے اندر آیات (جمع، مؤنث) کا مجموعہ ہے۔ قرءانِ مجید میں ہر ایک ایک بات کو نکھار کر عیاں فرمایا گیا ہے۔ اِس مَّثَانِيَ مجموعہ کے متعلق ارشاد فرمایا:۔

## هُوَ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ عَلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ

وہ جناب ہیں جنہوں نے مجتمع انداز میں کتاب خاص (قرءان مجید) کو آپ (ﷺ) پر نازل فرمایا ہے۔

## مِنْهُ ءَايَٰتٌ مُّحْكَمَٰتٌ

آئین حیات کے متعلق احکامات کو متعین کر دینے والی آیات اُس (قرءان) کا ایک جزو ہیں۔ (حوالہ ءال عمران۔۷)

آیت مبارکہ۔ هُوَ ٱلَّذِىٓ۔ سے شروع ہوئی ہے اور اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے اپنی اِن صفات۔ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ۔ کا بتایا اِس طرح واضح ہے کہ کتاب کا مجتمع انداز میں نزول اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے جو دائمی، ہر لمحہ، ہر مقام پر مطلق غالب ہیں۔ اور بدرجہ اتم انصاف پسند تمام موجود کائنات کے فرمانروا اور تمام پنہاں کو جاننے والے ہیں۔

## تَنزِيلُ ٱلْكِتَٰبِ

اللہ تعالیٰ کے کلام پر مشتمل کتاب (قرءان مجید) کا بتدریج اتارنا آپ (ﷺ) کے ذہن کو مسلسل حالت اطمینان میں رکھنے اور لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پہنچانے کے لئے ہے۔

## مِنَ ٱللَّهِ ٱلْعَزِيزِ ٱلْحَكِيمِ ۝١

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آسان فہم انداز میں تصنیف ہے جو دائمی، ہر لمحہ، ہر مقام پر حتماً غالب ہیں۔ اور بدرجہ اتم انصاف پسند تمام موجود کائنات کے فرمانروا اور تمام پنہاں کو جاننے والے ہیں۔ (الزمر۔۱)

اور قرءان مجید کے متعلق بتایا:

## تِلْكَ ءَايَٰتُ ٱلْكِتَٰبِ ٱلْحَكِيمِ ۝٢

یہ آیات اللہ تعالیٰ کے کلام پر مشتمل کتاب (قرءان مجید) میں سے ہیں؛ جس کی خصوصیت ہے کہ پنہاں کو عیاں کرتا بصیرت افروز ہے۔ (سورۃ لقمان۔۲)

---

## وَٱلْقُرْءَانِ ٱلْحَكِيمِ ۝٢

اور قسم ہے قرءان کی، جس کی خصوصیت ہے کہ پنہاں کو عیاں کرتا بصیرت افروز ہے۔ (یس۔۲)

ءَايَٰتٌ مُّحْكَمَٰتٌ۔ اِس مرکب توصیفی میں موصوف ءَايَٰتٌ [جمع، مرفوع، مؤنث] جملے کا موضوع/مبتداء ہے جسے مؤخر کیا گیا اور اس کی خبر کے متعلق۔ مِنْهُ جار و مجرور کو مقدم فرمایا گیا جس میں واحد مذکر غائب کی ضمیر کتابِ خاص یعنی قرءانِ مجید کیلئے ہے۔ اور اِن ايَ ٓتٌ، جنہیں کتابِ خاص کے مجموعہ کا ایک جزو بتایا گیا ہے، کی صفت مُّحْكَمَٰتٌ [جمع، مرفوع، مؤنث] ہے۔ بابِ اِفْعَال سے اسم مفعول [Passive Participle] کا صیغہ ہے جس کا مصدر "اِحْكَامٌ" اور مادہ "ح۔ ک۔ م" ہے۔ جناب ابن فارس نے کہا ہے کہ اِس مادہ کے بنیادی معنی بات سے روک دینا، منع کر دینا ہیں۔ روکنے اور منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو بتا دیا جائے کہ اُس کی آخری حد کونسی ہے جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اسی بات کو اختلافی امور میں فیصلہ کرنے کو کہتے ہیں یعنی ہر کسی کے حقوق و فرائض اور واجبات کی حدیں متعین کر دینا اور کسی کو اُن سے آگے نہ بڑھنے دینا۔ اسی کو حکم کہتے ہیں۔ حاکم کے معنی فیصلہ کرنے والا ہیں اور ظاہر ہے کہ فیصلے وہی کر سکتا ہے جو ٱلْعَزِيزُ ۔ یعنی قوت و غلبہ رکھنے والا ہو۔ ٱلْحَكِيمُ۔ کا مادہ بھی "ح۔ ک۔ م" ہے اور یہ اُن کیلئے بولا جاتا ہے جو ہر شئے کا صحیح مقام متعین کرے، کسی کو اُن حدود سے آگے نہ بڑھنے دے، وہ جو تمام امور میں صحیح فیصلے کرتا ہے۔ جو۔ ٱلْحَكِيمُ۔ ہے وہ اپنی ہر بات، امر، ارادے، حکم، اور فیصلے کے متعلق اُس کے ظاہر، عیاں کو بھی اور اسے بھی جو اُس میں پنہاں، مخفی ہے جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے کہ کائنات کو اپنے متعین کردہ صحیح راستے پر چلاتا ہے اور ہر شئے کو صحیح اندازے اور تناسب کے مطابق بغیر کسی تفاوت کے پیدا فرماتا ہے اور اپنے طے کردہ اصولوں، قانون،

مقدر/پیمانوں کے شکنجے میں کس کر کائنات کی ہر شئے کو مسخر کئے ہوئے ہے اور انسانوں کے اختلافی امور میں فیصلے کرتا ہے۔
اِن آیات کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دوسری خبر یہ عطا فرمائی ہے:

هُنَّ أُمُّ ٱلۡكِتَٰبِ

وہ (آیات محکمات) کتاب کی اساس۔بنیادی مقصد ہے (قاری کی حیات کو اس کا پابند بنانے کے لئے)۔

یہ بھی جملہ اسمیہ ہے جس میں۔ هُنَّ ضمیر منفصل مبنی علی الفتح فی محل رفع، جمع مؤنث غائب مبتداء ہے اور خبر مرکب اضافی کا پہلا اسم ہے جس کی حیثیت معرفہ ہے کیونکہ مضاف الیہ ٱلۡكِتَٰبِ معرفہ ہے۔ "کتاب خاص کی مادر خاص"۔
کسی چیز کو ایک مقام پر روک دیا جائے تو جم کر کھڑی ہو جانے کے سبب سے وہ مستحکم، محکم کہلاتی ہے۔اور یوں ءَايَٰتٌ مُّحۡكَمَٰتٌ۔ کے معنی اور مفہوم ایسی مفعول آیات ہیں جنہیں اپنی جگہ پر قائم اور اٹل کر دیا گیا ہے، جن میں بات کی حدود کو متعین کرنے، صاف اور دوٹوک فیصلہ کرنے والی باتوں، احکامات اور اصولوں کو بیان کر دیا گیا ہے جو۔ ٱلۡعَزِيزُ ٱلۡحَكِيمُ۔ قوت و غلبہ رکھنے والے اور پنہاں کو مکمل طور پر جاننے والے نے صادر فرمائے ہیں جن کی حیثیت ام الکتاب یعنی کتاب کی اصل کی ہے۔
قرءانِ مجید کو ٱلۡحَكِيمِ قرار دینے سے ءَايَٰتٌ مُّحۡكَمَٰتٌ کے معنی اور مفہوم نکھر کر واضح ہو جاتے ہیں کہ اِن کی باتوں کے معنی و مفہوم، وسعتیں، حدیں متعین، مستحکم ہیں اور تفاوت، تضاد، ٹکراؤ سے آزاد اور مبرا ہیں۔اِس بات کو پھیر کر سورۃ ھود کی ابتدا میں یوں بتایا:

الٓرۚ

عربی زبان کے حروف الف، لام بمع آواز کی طوالت کا نشان اور منسلک حرف ر

كِتَٰبٌ أُحۡكِمَتۡ ءَايَٰتُهُۥ

یہ کتاب جو آپ کے زیر مطالعہ ہے اس کا وصف یہ ہے کہ اس میں درج انفرادی بیانات (آیات) مستحکم، ناقابل تردید، پائدار فرمان کی حیثیت کی حامل بنا دی گئی ہیں۔

ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِن لَّدُنۡ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ١

بعد ازاں وقفے وقفے سے ان آیات کی ترسیل کے انہیں ان جناب کے حکم سے جدا جدا موضوعات کے فریم/فصل میں اس کتاب میں مدون کر دیا گیا ہے جو مطلق زمانروا ہیں اور مطلق باخبر ہیں۔

حیات و موت اور کائنات کی تخلیق کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ انسانوں میں سے أَحۡسَنُ عَمَلًا عمدہ عمل کون کرتا ہے۔
اہم ترین سوال یہ ہے کہ أَحۡسَنُ عَمَلًا کا پیمانہ، معیار اور کسوٹی کیا ہے؟ کون طے کرے گا کہ فلاں انسان أَحۡسَنُ عَمَلًا کی صفات کا حامل ہے اور کون اُس کی ضد ہے؟ أَحۡسَنُ عَمَلًا کی اقدار کون طے کرے گا؟ یہ سوال اتنا پیچیدہ نہیں کہ انسانی عقل و فہم اِس کا جواب نہ دے سکے۔أَحۡسَنُ عَمَلًا کے پیمانے، معیار، اقدار، کسوٹی اور حدود کا تعین کرنے کا مجاز وہی ہو سکتا ہے جو تخلیق کرے۔اور جو خالق تخلیق کا مقصد یہ بتائے کہ مخلوق أَحۡسَنُ عَمَلًا پر کاربند ہو تو یہ اسی کے ذمہ ہو جاتا ہے کہ یہ فیصلہ کرے اور حکم دے کہ اُس کے نزدیک أَحۡسَنُ عَمَلًا میں کون سے اعمال شامل ہیں اور اُن اعمال سے خبردار کرے جو اُس کے نزدیک أَحۡسَنُ عَمَلًا سے خارج ہیں یا اُن کی ضد ہیں۔اور انسان کا ہر عمل اُس کے جسم کے تین مراکز، سینہ، شکم، زیر ناف، میں سے کسی کی خواہشات اور بھوک کو مٹانے اور تسکین کے جذبے کے زیر اثر ہوتا ہے۔انسان کو اپنے جسم کے اِن تین مراکز کی بھوک اور خواہشات کی تسکین کیلئے معاشرتی زندگی کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔اِس لئے أَحۡسَنُ عَمَلًا کا تعلق اُن اقدار سے ہو گا جو معاشرے میں انسان کی بھوک کے اِن تین مراکز کی خواہشات کی تکمیل کیلئے۔ءَايَٰتٌ مُّحۡكَمَٰتٌ۔ میں متعین فرما دی گئی ہیں۔
ہم قرءانِ مجید کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت "مَّثَانِيَ " کے متعلق مطالعہ کر رہے ہیں جس سے ایک متناظر [Binary/Symmetrical-

analogous] مجموعہ کا اظہار ہوتا ہے۔اِس/ مجموعہ، جس کا واحد مثلیٰعنی دو دو ہے،اُس کے دوسرے جزو کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَأُخَرُ مُتَشَـٰبِهَـٰتٌ ۖ

اور اُن (آیات محکمات) کے علاوہ ایسی آیات اِس کتابِ خاص کے مجموعہ کا جزو ہیں جو تشبیہات کے ذریعے پنہاں کے متعلق بیان کردہ معلومات وعلم کو عیاں کر دینے کا فعل سرانجام دیتی رہیں گی۔

ءَايَـٰتٌ مُّحۡكَمَـٰتٌ۔ کی طرح۔أُخَرُ مُتَشَـٰبِهَـٰتٌ۔ بھی مرکب توصیفی ہے لیکن پہلی والی آیات سے بالکل مختلف کہ صفت۔مُتَشَـٰبِهَـٰت۔ ہے جو باب تفاعل کا اسم فاعل کا صیغہ ہے،یعنی ایسی آیات جو اشیاءاور تصورات کے مابین باہمی تعلق اور پنہاں حقیقتوں کو تشبیہات [Metaphors] کے ذریعے سامع اور قاری کے تصور [Perception] میں اجاگر کرنے کا فعل انجام دیتی رہیں گی۔ تشبیہ کے معنی کسی چیز کو اُس سے ملتی جلتی لیکن پنہاں چیز سے بیان اور واضح کرنا ہیں۔ مثال ظاہری مماثلت اور محسوس حوالے سے ہوتی ہے لیکن تشبیہ ایسی مماثلت کی نشاندہی کرتی ہے جو پنہاں، مخفی ہوتی ہے۔ تشبیہ محکم کی ضد نہیں ہے۔ قرءانِ مجید کی مُتَشَـٰبِهَـٰت ۔آیات اس کی۔ءَايَـٰتٌ مُّحۡكَمَـٰتٌ۔ کی ضد نہیں بلکہ ان کے علاوہ ہیں۔

مُتَشَـٰبِهَـٰت۔ کے معنی، غیر محکم، غیر واضح وغیرہ بھی نہیں ہیں۔ کسی بات کو کسی کیلئے مثال کے ذریعے واضح کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس سے قبل بات غیر واضح (vague) تھی۔ سوجھ بوجھ، فکر، عقل، علم کے حوالے سے لوگوں کی ذہنی سطح ایک جیسی نہیں ہوتی۔ تشبیہ دینے کا مقصود کسی کو اشتباہ اور التباس میں مبتلا کرنا نہیں بلکہ علمی، فکری، مادی یا زمان و مکان سے ماوراء کسی شئے کے بارے میں پنہاں حقیقتوں، علم کی لطافتوں، نزاکتوں اور باریکیوں کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ جن کی سوچ کے زاویے درست ہوتے ہیں وہ کم علمی کی بناء پر ان تشبیہات سے حقیقت کی تہہ تک چاہے نہ پہنچ سکیں لیکن کسی التباس کا شکار بھی نہیں ہوتے۔ جن کے دلوں میں میل (ٹیڑھا پن) ہوتا ہے اور جو درحقیقت حکم کی اطاعت کرنا نہیں چاہتے انہیں گائے کی عمر اور رنگ بتائے جانے کے بعد بھی شبہ ہوتا ہے کہ کون سی گائے کے بارے میں کہا جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا کسی بھی شخص کے ایمان اور یقین میں اضافہ کا سبب محض یہ بات بن سکتی ہے کہ اُسے فلاں عمل کرنے کا حکم دیا جائے اور فلاں عمل سے منع کر دیا جائے یا اعمال کے متعلق احکامات دینے کی وجہ سے اہل ایمان کے بدن میں خوف کی لہر دوڑنے اور جلد کے کپکپانے اور لرزنے، رونگٹے کھڑے ہونے کا کیا کوئی جواز بنتا ہے؟ بدن میں خوف کی لہر اُس وقت دوڑتی ہے اور رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں جب پنہاں ظاہر ہو کر نظروں کے سامنے یا ادراک میں آ جائے۔ یہ مثبت خوف ہے جس کا نتیجہ خیر ہے جس کے بعد ازاں جلد اور دل نرم ہو جاتے ہیں۔ اگر پنہاں عیاں ہونے پر اللہ کے خوف سے دل میں لرزہ طاری نہ ہو تو قلوب سخت ہو جاتے ہیں۔
جب تشبیہ اور اُس کی اصل۔ تاویل۔ تعبیر، نتیجہ آمنے سامنے آ جائیں تو پنہاں ظاہر ہو کر احاطہ ادراک میں آ جاتا ہے۔ حقیقت مشہود ہونے پر دلوں پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ اور حقیقت عیاں ہونے پر طاری ہونے والا یہ خوف ایمان اور یقین کو پختہ اور غیر متزلزل کر دیتا ہے، دل نرم ہو جاتے ہیں۔ ساحروں نے فرعون کے دربار میں حقیقت کو عیاں ہوتے دیکھا تو سجدہ ریز ہو گئے۔ آیات متشابہات نے اہل علم کیلئے پنہاں حقیقتوں کو زمان و مکان پر محیط تشبیہات سے سمجھاتے رہنا ہے یہاں تک کہ جب وہ پنہاں حقیقتیں عیاں ہو کر اُن کی بصارتوں کے احاطہ میں آئیں گی تو انہیں وہ حقیقت اُس تشبیہ کے مطابق ہی دکھائی دے گی۔

سَنُرِيهِمۡ ءَايَـٰتِنَا فِى ٱلۡأَفَاقِ وَفِىٓ أَنفُسِهِمۡ

ہم جناب انہیں (قرءانِ مجید کا انکار کرنے والے) آج کے بعد سے آفاق کے گوشے گوشے اور خود اُن کے جسموں میں پنہاں مادی حقیقتوں (آیات) کا گاہے بگاہے مشاہدہ کراتے رہیں گے۔

حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ أَنَّهُ ٱلۡحَقُّ ۗ

انہیں مشاہدہ کرانے کا مقصد یہ ہے کہ اُن کے لئے از خود واضح ہو جائے کہ یہ (قرءانِ مجید) بیانِ حقیقت ہے۔ (حوالہ فصلت۔۵۳)۔

قرءانِ مجید کی آیات میں آفاق اور نفس انسان کے متعلق بیان کیا گیا علم بتدریج انسان کے مشاہدے میں آئے گا کہ علم ہمیشہ ظاہر سے پنہاں کی جانب سفر کرتا ہے اور پنہاں جب نظروں میں آجائے تو اِس پنہاں کو مشاہدے میں آنے سے قبل ازیں بتانے والے کے بیان کے متعلق انسان کو واضح ہو جاتا ہے کہ بیانِ حقیقت ہے۔

سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِى یعنی۔سُورَةُ الفَاتِحَة۔واحد سورۃ ہے جس کی ابتداء میں ایمان والوں کیلئے آیت ہے:

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَـٰنِ ٱلرَّحِيمِ ١

[آقائے نامدار رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا] اللہ تعالیٰ کے اسم ذات الرَّحْمٰن سے ابتداء ہے جو منبع رحمت ہیں۔(۱)

قرءانِ مجید کے طبع شدہ/تحریری نسخوں میں ہر سورۃ سوائے سورۃ التوبہ کے آغاز میں بغیر نمبر کے اِس آیت مبارکہ کو مسلم عوام الناس کی سہولت کیلئے اِس وجہ سے شامل کیا جاتا ہے کہ اِس حکم کی تعمیل ہو کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو پڑھنے کی ابتداء ان الفاظ سے کرنی ہے۔اِس آیت مبارکہ کو بغیر نمبر کے لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ قرءانِ عظیم کی ایک سو تیرہ سورتوں کی ابتداء میں یہ آیت مبارکہ اصل تحریر [Text] کا حصہ نہیں ہے کیونکہ قرءانِ عظیم ہر ایک انسان کیلئے نازل فرمایا گیا ہے جن میں وہ بھی شامل ہیں جو زمان و مکان کے کسی مقام پر اللہ تعالیٰ کو ماننے ہی سے انکاری ہیں۔

سَبۡعًا مِّنَ ٱلۡمَثَانِى صرف اُن لوگوں کیلئے ہے جو اللہ تعالیٰ، رسول کریم ﷺ اور قرءانِ عظیم پر ایمان رکھتے اور لے آتے ہیں یہ غیر مسلموں کیلئے نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرءانِ عظیم کی ایک سو تیرہ سورتوں کی چھ ہزار دو سو انیتس آیات کے مواد میں سے چھانٹ کر، الگ کر کے سات آیات پر مشتمل ایک سورۃ اِس انداز میں مرتب کر کے عنایت کی ہے کہ اِن آیات کے الفاظ وہ ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ، رسول کریم ﷺ اور قرءانِ عظیم پر ایمان لانے والوں کیلئے ہیں۔اس سورۃ کے بعد متکلم، اللہ تعالیٰ، الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام ہیں اس لئے ابتدا۔بِسۡمِ ٱللَّهِ سے نہیں ہے۔

اس سورۃ میں الفاظ کی تعداد اکتیس ہے جن میں حرف عطف "وَ" کو الگ لفظ شمار کیا گیا ہے۔اس ترتیب سے ان جذور/ماخذ کو متعارف کیا گیا ہے۔

(۱)س م و(۲) ر ح م (۳)ح م د (۴)ر ب ب(۵)ع ل م(۶)م ل ك(۷) ی و م(۸)د ی ن(۹)ع ب د(۱۰)ع و ن(۱۱)ھ د ی(۱۲)ص ر ط(۱۳)ق و م(۱۴)ن ع م(۱۵)غ ی ر؛(۱۶) غ ض ب۔(۱۷)ض ل ل۔

حروف اور حرکات بشمول تشدید اور مد او غیرہ کے نشانات کی کل تعداد دو سو باسٹھ (۲۶۲) ہے۔

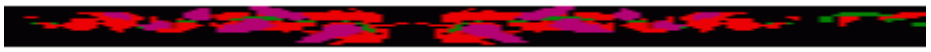



ترجمہ آیت۔۱

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَـٰنِ ٱلرَّحِيمِ ١

آقائے نامدار رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اسم ذات الرَّحْمٰن سے ابتداء ہے جو منبع رحمت ہیں۔(۱)

Video Urdu adjective: ٱلرَّحِيمِ Video Proper Noun: ٱلرَّحۡمَـٰنِ;

تحلیل نحوی و صرف:

1۔بِسۡمِ ٱللَّهِ۔ باہم متصل یہ دو مرکبات ہیں؛جار و مجرور اور مرکب اضافی حقیقی(أَلإضَافَةُ ٱلْحَقِيقِيَّةُ )۔بِسۡمِ : جار و مجرور۔بِ حرف جر للاِسْتَعَانَةِ+اسم مجرور-واحد-مذکر، معرفہ بسبب اضافت،اور بعد والے مرکب کا مضاف ہے۔ماخذ"س۔م۔و"۔ٱللَّهِ:اسم علم،مذکر،مجرور للتعظیم،مضاف الیہ۔

2۔ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ۔مرکب توصیفی(النَّعْتُ الحَقِيقِيُّ)۔اسم علم،اللہ تعالیٰ کا اسم ذات/ہستی۔بدل اللہ،مجرور۔موصوف۔ اسم المبالغة-معرفه باللام-مجرور-واحد مذکر۔صفت۔ماخذ"ر۔ح۔م"۔

---

چند معروف تراجم:

ڈاکٹر طاہر القادری:"شروع اللہ کے نام سے،جو نہایت مہربان،رحم فرمانے والا ہے"۔

احمد رضا خان:"اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا"

فتح محمد جالندھری:"شروع اللہ کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔"

مولانا مودودی:"اللہ کے نام سے جو رحمان ورحیم ہے"

یہ تراجم علمی کاوش کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ محض ان انگریزی تراجم کا اردو ورژن ہے جو اپنے آپ کو عیسائی کہنے والوں نے بہت عرصہ قبل کئے تھے،جو نیچے درج ہیں۔جنہیں انگریزی نہیں آتی وہ اس کو گوگل میں ڈال کر اردو ترجمہ دیکھ لیں۔

George Sale: In the name of the most merciful God.

JM Rodwell: In the Name of God, the Compassionate, the Merciful

---

تحلیل۔تشریح معنوی ومفہوم،بلاغت

یہ ساخت کے حوالے سے اختصار پر مبنی(elliptical sentence)جملہ ہے۔معنی اور مفہوم کے حوالے اس کی نوعیت اعلامیہ،اعلانیہ ہے جسے انگلش گرائمر میں Declarative sentence کہتے ہیں۔

یہ جملہ ایک حرف(بِ)اور چار اسموں پر مشتمل ہے۔راشد خلیفہ حروف،جو آنکھوں کو دکھائی دیتے ہیں، کی گنتی بھی دانستہ غلط کرتا ہے اپنے دماغی خلل سے پیدا کردہ "کوڈ" کو تقویت دینے کے لئے۔حروف انیس(19) نہیں ہیں۔آئیں لفظوں کو بول کر توڑتے ہوئے خود لکھیں اور خود گنیں۔

۱:بِ؛۲:سۡ۳:مِ۴:اَ؛۵:ل؛۶:لٰ؛۷:لَ؛۸:ہِ؛۹:اَ؛۱۰:ل؛۱۱:رۡ ۱۲:رَ؛۱۳:حۡ؛۱۴:مَ؛۱۵:ا؛۱۶:نِ؛۱۷:اَ؛۱۸:ل؛۱۹:رۡ؛۲۰:رَ؛۲۱: حِ؛۲۲:یۡ؛۲۳:مِ۔

اور معنی اور مفہوم کے لئے گرائمر کے حوالے سے ظاہری طور پر اس کے دو جزو ہیں:

پہلا جزو دو مرکبات کا مجموعہ ہے،جار و مجرور(prepositional phrase)اور مرکب اضافی(Possessive phrase)اور دوسرا جزو مرکب توصیفی(adjectival phrase)ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان میں سے کسی اسم کے آخر میں حرف علت پیش نہیں ہے یعنی کوئی بھی اسم مرفوع نہیں ہے۔اور ابتدا میں جار و مجرور(prepositional phrase)ہے جو نہ تو جملے کا موضوع/مبتداء(subject/topic)ہوتا ہے اور نہ ہی خبر۔

ایسے جملے جن میں کوئی اسم مرفوع نہیں اور اس میں کوئی فعل بیان کرنے والا لفظ نہیں ہے تو یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کی ابتدا میں کوئی لفظ محذوف ہے یعنی کوئی اطلاع کم/

missing ہے۔ماہرین گرائمر کہتے ہیں کہ اس جملے کے شروع میں ایک فعل محذوف ہے۔
ان تین مرکبات پر مشتمل الفاظ کے معنی ظاہر کرتے ہیں کہ اس جملے کی نوعیت معلوماتی/بیانیہ/declarative ہے ۔ اور ہم جانتے ہیں کہ ایسے بیانیہ جملوں کے لئے حوالہ/citation درکار ہوتا ہے۔ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا آغاز/prelude-prologue ہے اور اس کو سب سے اول آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اور دائیں دست مبارک سے تحریر فرما کر لوگوں کو دیا تھا، اس لئے محذوف فعل اور فاعل کو ترجمے میں ان الفاظ سے میں نے بیان کیا ہے ''آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا''۔

کلام اللہ کو پڑھنے، سمجھنے اور اس کا گہرائی اور گیرائی سے ادراک کرنے کے لئے تصریف آیات کے اصول سے استفادہ کرنا چاہئے۔ یہ جملہ دو بار استعمال ہوا ہے۔ دوسری بار آیت ۲۷:۳۰ میں مشبہ بالفعل حرف اِنَّ کی محذوف خبر کے متعلق ہے جو سلیمان علیہ السلام کا ایک ملکہ کے نام تحریر کردہ خط (عربی میں کتاب) کا ابتدائیہ، Prologue تھا۔

قَالَتْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَؤُا۟

ان محترمہ (ملکہ سبا) نے کہا'' معزز سردارو؛ توجہ کریں۔

إِنِّىٓ أُلْقِىَ إِلَىَّ كِتَٰبٌ كَرِيمٌ ﴿٢٩﴾

آپ کے علم میں اس حقیقت کو لانا ہے کہ ایک انتہائی نفیس مکتوب کو میرے روبرو پیش کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

إِنَّهُۥ مِن سُلَيْمَٰنَ وَإِنَّهُۥ

یہ (مکتوب) سلیمان (علیہ السلام) نے مجھے پہنچانے کے لئے بھیجا ہے۔ اور اس کا ابتدائیہ یہ ہے:

بِسْمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ﴿٣٠﴾

''اللہ تعالیٰ کے اسم ذات الرَّحمٰن سے ابتدا ہے، وہ جناب منبع رحمت ہیں۔ (النمل۔ ۳۰)

اس خط کے دوسرے جملے میں حرف مشبہ بالفعل اِنَّ کی خبر سے متعلق حصے کو سورۃ الفاتحہ کی سات میں سے پہلی آیت کے طور پر ایک مکمل جملے کی صورت عنایت فرمایا گیا ہے۔ ہم بھی ملکہ سبا کی طرح کہہ سکتے ہیں کہ قُرْءَانٌ كَرِيمٌ ہم تک پہنچا دیا گیا ہے اور ہماری آنکھوں کے روبرو ہے۔ یہ ہمارے رہنما، معلم کے دائیں دست مبارک سے تحریر کردہ انتباہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھوں میں پہنچا دیا ہے:

وَأُوحِىَ إِلَىَّ هَٰذَا ٱلْقُرْءَانُ لِأُنذِرَكُم بِهِۦ وَمَنۢ بَلَغَ ۚ

اور یہ قرءان مجید مجھے زبانی (وحی) پہنچایا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ میں تم لوگوں (اپنے ہمعصر، ہم نشیں) کو کفر و نافرمانیوں کے نتائج و انجام سے پیشگی خبردار کروں **اور ہر اس شخص کو جسے زمان و مکان میں یہ قرءان پہنچ گیا۔** (حوالہ الانعام۔ ۱۹)

اللہ تعالیٰ کے منفرد اور یکتا نام الرَّحمٰن ذوالجلال والاکرام سے ابتدا کر کے، ہم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور نبی امی ﷺ کی اتباع کا شرف حاصل کیا ہے کہ انہوں نے بھی کلام اللہ کو ایسے ہی پڑھنے کی ابتدا کی تھی جب انہیں منصب رسالت پر فائز فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے انہیں قرءان عظیم عنایت فرمایا تھا:

## ٱقْرَأْ بِٱسْمِ رَبِّكَ ٱلَّذِى خَلَقَ ۝

[جبرئیل علیہ السلام نے پیغام اور کتاب پیش کرتے ہوئے کہا] ''آپ(ﷺ)اپنے رب کے منفرد اسم ذات (الرّحمٰن) سے ابتدا فرماتے ہوئے اِس کتاب کو پڑھیں؛وہ جناب وہ ہستی ہیں جنہوں نے مادی عالم کو تخلیق فرمایا ہے۔(العلق۔۱)

## ''بِسۡمِ'' معنی و مفہوم۔ربط و تسلسل

اکیڈیمک اصول یہ ہے کہ تحریر میں مصنف کے بیان کردہ تصور اور مقصدِ بیان تک پہنچنے کے لئے ہر ایک جملے کو پہلے انفرادی الفاظ کی سطح پر سمجھا جائے، پھر مرکبات کی سطح پر اور آخر میں الفاظ اور مرکبات کے مابین مصنف نے تعلق پیدا کرنے کے لئے جس انداز میں انہیں جملے میں ترتیب دیا ہے اسے سمجھا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام کے پہلے جملے کا پہلا لفظ ''بِسۡمِ'' مرکب [Phrase] ہے کہ ایک حرف اور اسم پر مشتمل ہے، تین مرتبہ ہے:(1)01:01(2)11:41(3)27:30=3

چار دوسرے مقامات پر اس طرح تحریر فرمایا گیا ہے۔''بِٱسۡمِ'':(1)56:74(2)56:96(3)69:52(4)96:01=4

زبان اور ہونٹوں سے ادائیگی اور سننے والے کی سماعت کیلئے دونوں میں قطعی کوئی فرق نہیں۔اِس ایک جملہ نما لفظ کی دو طرح سے تحریر سے ثابت ہے کہ انہیں کسی سننے والے نے اول مرتبہ ضبط تحریر نہیں کیا تھا بلکہ اُن ﷺ ہی کے دائیں دست مبارک نے اِنہیں اول مرتبہ تحریر فرمایا تھا جنہوں نے ہونٹوں اور زبان مبارک سے انسانیت کی سماعتوں تک پہنچایا تھا۔

عربی زبان کی گفتگو اور تحریر میں حروف کی اہمیت کا ادراک کرنے کیلئے یہ حقیقت کافی ہے کہ قرءانِ مجید کی ابتداء ایک حرف سے ہوئی ہے۔اِس عظیم کتاب کا ہر ایک انداز دنیا میں موجود تمام کتابوں سے منفرد اور یکتا ہے بالکل اُن منفرد اور یکتا کی مانند جن کا کلام اِس میں درج ہے اور اُن کی مانند منفرد اور یکتا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اِس کلام کو اپنے مبارک ہونٹوں اور زبان سے قول فرمایا اور اپنے دائیں دست مبارک سے تحریر کر کے انسانیت کو عطا فرمایا۔ کہا جاتا ہے کہ حرف جر، کی تعریف definition کو متعین کرنا مشکل ہے مگر اُسے سمجھنا بالکل آسان ہے۔قرءانِ مجید کی ابتدا، سمجھنے کیلئے آسان حرفِ جر سے ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہمارے رہنما آقا، آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ کی زبان مبارک میں قرءانِ مجید کو پڑھنے، سیکھنے، سمجھنے اور یاداشت میں محفوظ رکھنے اور بیان کرنے کیلئے سہولت مہیا کرنے والے کے طور مدون کیا گیا ہے۔

قرءانِ عظیم کا پہلا لفظ ''بِسۡمِ'' حرف اور اسم کا مرکب ہے۔حرف تہجی ''ب'' حرف علت زیر کے نشان کے ساتھ بِ کو حرفِ جر اور انگلش میں Preposition کہتے ہیں۔یہ اپنے ساتھ منسلک اسم/Noun کی حالت کو تبدیل کر کے اُس کے آخر میں زیر لگا کر اُسے مجرور یعنی Genitive بنا دیتا ہے اور اِس باہمی تعلق کو گرائمر کے ماہرین جار و مجرور کہتے ہیں۔ **عربی زبان کے اسماء اپنی اصل حالت/default setting میں ہمیشہ مرفوع ہوتے ہیں** یعنی اُن کے آخر میں ''پیش'' کا نشان یا تنوین یعنی دو پیش ہوتی ہیں۔اِس لئے جملے میں اگر کوئی اسم اپنی اصل حالت میں نہیں ہے یعنی اُس کے آخر میں زیر یا زبر ہے تو اُس کی وجہ معلوم کرنے کی ہمیں کوشش کرنا چاہئے۔جیسے یہاں ہم نے لفظ ''اسمُ'' کے حالت جر میں ہونے کی وجہ جان لی کہ حرف جر یعنی ''بِ'' کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ **اسم کے آخری حرف پر جزم کبھی نہیں ہوتی اور فعل کے آخری حرف پر زیر نہیں ہوتی۔**

حرف جرِ وسیع تر مفہوم میں ربط اور قربت/contiguity کا اظہار کرتا منسلک الفاظ کی نسبت سے مختلف معنی اور کردار کا حامل ہوتا ہے ۔ چونکہ اس سے منسلک لفظ اسم ہے تو اس کے تسلیم شدہ معانی میں سے ارتباط، مصاحب یا استعانت کے لئے جا سکتے ہیں۔اسم یعنی نام، علم کے حصول کی ابتدا ہے ۔ اسم جانکاری اور رابطے کا ذریعہ ملا ہے۔ **پہلا مرکب کائنات کے نظام کی بنیاد کا اظہار اور پہلا حرف انسان کے ارادہ و اختیار، حریت اور ''میں'' پر مادرِ رحم سے لحد تک فقط معاشرت، ربط و**

**الصاق اور تعاون کی محتاجی لاحق ہونے کا مظہر ہے۔**

اللہ تعالیٰ کے کلام میں یہ جملہ دو بار ہے جس میں خالق کائنات کے دونوں یکتا نام اللہ اور الرّحمٰن موجود ہیں۔ اور ایک ایک بار اللہ تعالیٰ اور الرّحمٰن کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ "اَلْمُسْتَعَانُ" ہیں یعنی جن کی جانب استعانت کے لئے رجوع کیا جاتا ہے۔ (حوالہ سورۃ یوسف۔۱۸ اور الانبیاء۔۱۱۲)

اِس مرکب کے عام فہم معنی ہیں "اسم/نام سے ابتدا ہے۔ "Beginning is with the name/code

عربی زبان کے الفاظ کی اکثریت کا ماخذ ایک تین حرفی ترتیب ہے جسے مادہ/root کا نام دیتے ہیں۔

اِس لفظ "اسم" کا مادہ "س۔م۔و" ہے جس میں سمو یا بنیادی تصور عروج، بلند و بالا پن، ارتفاع، وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ اس سے "اَلسَّمَآءُ" یعنی آسمان ہے۔ یہ شئے اور ہستی کا نام ہے جو اپنے تعین، تعارف اور حوالے کے لئے دوسرے کا محتاج نہیں۔ قرءانِ عظیم کا پہلا لفظ مادی کائنات کے متعلق سب سے اول حقیقت /first ever scientific fact کو بیان فرما رہا ہے کہ تخلیق اور اسم لازم و ملزوم ہیں۔ تخلیق کار جب شئے کو وجود دیتا ہے تو بیک وقت اُس کا نام بھی متعین کرتا ہے جس کی بناء پر وہ شئے دوسری تمام اشیاء سے متمیز اور منفرد ہو جاتی ہے۔ **نام پہلے سے موجود ہستی کا اظہار کرتا ہے اور نام / کوڈ تخلیق کردہ شئے اور ہستی کو انفرادیت /individuality عطا کرتا ہے جو اُس کا تعارف بن جاتا ہے اور اُس کے وجود پذیر ہونے کا ثبوت چاہے وہ شئے یا ہستی کسی کی بصارتوں سے اوجھل کیوں نہ ہو۔ جس کتاب عظیم کا اول لفظ مادی کائنات کی اول حقیقت کو بیان کرتا ہو اُس کتاب کے متعلق عدم ربط و تسلسل کی بے سروپا بحث پر سوائے افسوس کے کیا کہا جائے۔**

اگر آپ یا میں، یا کوئی بھی خالق کسی شئے کو محض اپنے مشغلے /Pass time کیلئے تخلیق کرتا ہے تو پھر اُس شئے کو نام دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر خالق نے کسی دوسرے کیلئے شئے کو تخلیق کیا ہے تو پھر اُس شئے کو دوسرے کو متعارف کرانے کیلئے نام دینا ضروری ہے۔ اور یوں تخلیق شدہ کو اُس کا نام یہ اہمیت عطا کر دیتا ہے کہ اُس کا وجود مقصدیت /significance کا حامل ہے۔

"بِسْمِ"۔ اسم/نام سے ابتدا ہے۔ اور اگر گرائمر کے نکتہ نظر سے دیکھیں تو سب سے اول تعلق /relationship جو وجود میں آیا وہ آزاد /Independent اور محتاج یعنی dependent کا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ

اے لوگو! دھیان سے سنو!

أَنتُمُ ٱلْفُقَرَآءُ إِلَى ٱللَّهِ ۖ

تم لوگ قدرتی طور پر دائمی حاجت مند ہو، زمان و مکان میں بالآخر تمہیں اللہ تعالیٰ کے حضور گدا گر بننا پڑتا ہے۔

وَٱللَّهُ هُوَ ٱلْغَنِىُّ ٱلْحَمِيدُ ﴿١٥﴾

اور اللہ تعالیٰ مطلق آزاد، سراحتیاج سے منزہ اور بلند و بالا ہیں، اور مطلق شرف و کبریائی کا بیان حمد ہمیشہ ان کے لئے ہے۔ (فاطر۔۱۵)

**اسم سے ابتدا ہے۔** انسان اور آج کے دور میں کمپیوٹر کی یاداشت /Memory میں بھی کوئی چیز اُس وقت تک محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک اسے ایک کوڈ/اسم نہ دیا جائے۔ نام شئے اور ہستی کا محض تعارف / معرفت اور شناخت ہے اُس کی پہچان نہیں۔ نام شئے یا ہستی کو "نکرہ" عام یعنی commonaility سے نکال کر معرفہ specific or proper noun تو بنا دیتا ہے جس سے اُس کے وجود میں ہونے کا اظہار ہو جاتا ہے جو علم کی ابتدا ہے مگر یہ نام اُس شئے یا ہستی کی پہچان نہیں کہلاتا کیونکہ کسی بھی شئے اور ہستی کو ہم صرف اُس صورت میں پہچان سکتے ہیں اور اُس کے متعلق علم رکھنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں جب اُس شئے یا ہستی کا باطن ہماری بصارتوں اور ادراک میں آجائے۔ **ہمیں شئے کے باطن کا اور ادراک اُس کی "تقدیر" یعنی اُس کے پیمانے اور دوسری اشیاء کے ساتھ باہمی ربط و تعلق کو دیکھنے اور جانچنے سے**

ہوتا ہے۔اس مشاہدے اور جانچنے کو آپ سائنس کہتے ہیں۔

مگر شئے اور ہستی میں فرق ہے۔ ہستی کو ہم اُس وقت پہچان سکتے ہیں جب اپنے باطن کو وہ خود نمایاں کرے،اُس کا اظہار کرے،اپنی خصوصیات کو نمایاں اور عیاں کرے اپنے فعل و عمل سے۔اور جو ہستی اپنے باطن کو مکمل طور پر نمایاں کر دے وہ ظاہر سے بھی زیادہ ظاہر ہوتا ہے چاہے اُس کا ظاہر ہماری بصارتوں کے احاطہ میں نہ ہو، یہ ہماری بصارتوں کی کجی اور کمزوری ہے۔ وہ ہر لمحہ ہمارے پاس ہوتا ہے۔

## ''بِسۡمِ ٱللَّهِ'': جار و مجرور+مرکب اضافی حقیقی

ہم نے ایک متصل حرفِ جر اور ایک اسم سے بنے مرکب کے مطالعہ میں دیکھا کہ حرف جر کی وجہ سے اسم کی اعرابی حالت یعنی اُس لفظ کے آخر میں موجود حرف علت [Vowel] کی نوعیت بدل جاتی ہے۔اسم جو اپنی اصل حالت میں مرفوع تھا یعنی اُس کے آخر میں ایک پیش یا دو پیش تھیں وہ ایک زیر یا دو زیر کا حامل بن کر اسم مجرور ہو گیا۔ اگر آیت مبارکہ کے پہلے دو الفاظ میں سے حرفِ جر ''بِ'' کو ہٹائیں [Truncate] تو انہیں ایسا لکھا جائے گا: ٱسۡمُ ٱللَّهِ۔ یہ قرءانِ مجید میں چار مرتبہ ہے ان آیات میں: الانعام۔۱۱۸؛۱۱۹؛۱۲۱اور سورۃ الحج۔۴۰۔ یہ مرکب اضافی [Possessive Phrase] ہے۔

دو اسموں کے مابین ایسا تعلق اور نسبت موجود ہو جو حقیقت پر مبنی ہو تو ایک اسم کے ساتھ دوسرے اسم کی اضافت گرائمر کی زبان میں مرکب اضافی حقیقی کہلاتا ہے۔ایسے مرکب کا پہلا اسم اپنے سے بعد والے اسم کے ساتھ ایک نسبت اور تعلق کا اظہار کرتا اور مضاف کہلاتا ہے اور دوسرے اسم کو مضاف الیہ کہتے ہیں ۔ جو اسم مضاف الیہ ہے وہ ہمیشہ مجرور/حالت جر میں ہو گا۔اور جو اسم مضاف ہے یعنی اِس مرکب کا پہلا جزو ہے اُس کی ابتداء میں اسماء کو معرفہ [Definite] بنانے والا حرف [Definite Article] ''ال'' کبھی نہیں ہو گا اور مزید بصری پہچان یہ ہے کہ اُس پر تنوین یعنی دو زیر، دو زبر، دو پیش کبھی نہیں ہوں گی۔ خارجی عوامل کی بناء پر اُس پر پیش کے علاوہ ایک زیر یا ایک زبر ہو سکتی ہے جیسے اِس پہلے مرکب اضافی حقیقی کے پہلے اسم یعنی مضاف کے آخر میں زیر ہے بسبب حرفِ جر ''بِ''۔
یہ معلوم حقیقت ہے کہ اسماء کے مابین تعلق اور نسبت کے متعدد انداز اور زاویئے ہیں جن میں جنس [Gender] اور تعداد/واحد، تثنیہ اور جمع [Plurality] حائل نہیں ہوتی۔اِس لئے اِن دونوں حوالوں سے مرکب اضافی حقیقی میں مضاف اور مضاف الیہ اپنی اپنی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں اور مرکب اُس حیثیت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

مرکب اضافی میں مضاف الیہ نکرہ یعنی غیر معروف اسم۔[Indefinite Noun] ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ اسم معرفہ ہے [Definite/Proper Noun] تو پھر مضاف، باوجود کہ بظاہر نکرہ ہے، اسم معرفہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ساتھ حرف ''ال'' اور تنوین متصل/منسلک نہیں ہوتی۔

چونکہ مرکب کا دوسرا اسم، اسم علم (proper noun) ہے اس لئے پہلا لفظ اسم بھی معرفہ (definite) ہے یعنی۔ ٱلِٱسۡمُ۔ ہے، بمعنی خاص/مخصوص نام، کہنے اور سننے والے کیلئے جانا پہچانا نام جس کی نسبت اور تعلق طے شدہ اور مخصوص ہے۔اس طرح اس مرکب اضافی کے معنی ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا مخصوص نام/ذاتی نام'' ۔ یاد رہے مرکب اضافی دو مختلف اسموں کے مابین تعلق کو بیان کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اور ان کا مخصوص نام دو حقیقتیں ہیں۔

جملے میں جب دو مرکب اکٹھے ہوں تو وہ معنی اور مفہوم کے لئے جملے کا ایک جزو ہوتے ہیں۔ ''بِسۡمِ ٱللَّهِ'' ایک جزو ہے، اور اس کے معنی بن گئے: 'اللہ تعالیٰ کے مخصوص نام سے ابتدا ہے''، جسے پکار کر یا یاد کر کے ہر قول و فعل کی ابتداء کرنی ہے۔
**عربی زبان کی تحریر کے جملوں میں موجود الفاظ کا اپنے سے قبل اور مابعد الفاظ سے نسبت اور تعلق اور خود اُس کی اپنی حیثیت اور ادائیگی کردار کا تعین کرنا جملے میں موجود تصور، معنی اور مفہوم کو غیر مبہم انداز میں سمجھنے کی بنیادی شرط ہے۔** الفاظ کے محض انفرادی معنی معلوم ہونے سے جملے کے معنی، مفہوم اور اُس میں بیان کیا گیا تصور اُس وقت تک سننے اور پڑھنے والے کے ذہن کو منتقل نہیں ہو سکتا جب تک الفاظ کے مابین موجود تمام نسبتوں اور تعلق کی اُسے جانکاری ہو۔

## ''بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ''

"بِسۡمِ ٱللَّهِ" کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کا اسمِ ہستی/مخصوص اور یکتا اسم گرامی قدر اَلرَّحۡمَـٰنِ (ذوالجلال والاکرام) ہے۔

اِس یکتا اسم کے آخر میں بھی زیر ہے یعنی اِس مقام پر یہ بھی اسم مجرور ہے۔ گرائمر کے ماہرین اِس کی وجہ یہ اصول بتاتے ہیں کہ پہلے بیان کردہ اسم کے متبادل [Equivalent Apposition] جو اسم جملے میں موجود ہو گا اُس کی اعرابی حالت، جنس [Gender] اور عددی حیثیت [واحد/ تثنیہ/جمع] قبل والے اسم کے مطابق ہو گی۔ یہاں چونکہ قبل والے اسم کی اعرابی حالت مجرور ہے اِس لئے اِس اسم کے آخر میں بھی زیر ہے اور دونوں اسم واحد، مذکر ہیں۔

"بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَـٰنِ" "اللہ تعالیٰ کے مخصوص/یکتا/جانے پہچانے اسم ہستی/ذاتی نام الرحمٰن سے ابتدا ہے"۔ اردو کا لفظ "ابتدا" عربی سے مشتق ہے؛ جس کی عربی میں املا "ابتداء" ہے جو باب افتعال کا مادہ "ب۔د۔ء" سے مصدر ہے، اور اس کے معنی کسی امر کی بسم اللہ، شروعات، آغاز ہیں ۔ اور باب افتعال کی وجہ سے اس کے لئے ارادہ اور قوت کا پہلے سے موجود ہونا لازم ہے۔ مگر عربی کے حرف "بِ" میں الصاق اور استعانت کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ " ٱلۡمُسۡتَعَانُ" ہیں جن سے ہر امر کے لئے ہم تعاون کے طلبگار اور خواہش مند ہیں۔ **ہم در حقیقت کسی بھی امر کی ابتدا کر ہی نہیں سکتے جب تک اللہ تعالیٰ کا اِذن اور اُن کا تعاون حاصل نہ ہو۔ یہ کائنات اور موجودات میں سب سے اول حقیقت ہے۔**

## "ٱلرَّحۡمَـٰنُ" اللہ تعالیٰ کا اسم ذات ہے؛ صفاتی ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ میں سے نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے کلام کی پہلی آیت مبارکہ میں "ٱلرَّحۡمَـٰنِ" اسم علم کا ترجمہ کرتے ہوئے اولین مترجمین میں شمار ہونے والے دو عیسائی انگریز سکالروں جارج سیل (George Sale) اور جان روڈویل (John Medows Rodwell) نے اسے صفت (adjective) بنا دیا تھا۔ انہوں نے اس کا ترجمہ "the most merciful" اور "compassionate" کیا تھا۔ مگر جان روڈویل نے زیادہ مقامات پر اس کا ترجمہ God of mercy کیا۔
ان کے بعد کے انگریزی اور اردو زبان کے مترجمین نے ان ہی کے ترجمے کو نہ جانے کس بنیاد پر مستند مان کر یہی ترجمہ اختیار کیا۔ اردو میں اِس کا ترجمہ "بڑا مہربان، بہت مہربان، نہایت مہربان" کیا گیا جو ایک صفت بیان کرتے ہیں اور انہی انگریزی الفاظ کا اردو ترجمہ ہے۔ اور زیادہ مقامات پر اس کا ترجمہ "خدائے رحمان" کیا۔
ایک ترجمے کی مثال لیتے ہیں۔ شیخ السلام ڈاکٹر طاہر القادری صاحب نے نو مقامات پر اس کا ترجمہ "نہایت مہربان" کیا۔ دس مقامات پر "رحمان"، ایک مقام پر "اللہ" اور سینتیس مقامات پر اس کا ترجمہ "خدائے رحمان" کیا۔ یہ سینتیس مقام وہی ہیں جہاں روڈویل نے ترجمہ God of mercy کیا تھا۔

ہستی کا ذاتی نام [Personal Name] ہمیشہ واحد ہوتا ہے، اِس کی تثنیہ اور جمع نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی ایسا قاعدہ ہے کہ ایک مذکر کے ذاتی نام کو مؤنث بنایا جا سکے جبکہ عربی زبان میں اوصاف کو بیان کرنے والے اسماء [Adjectival Names] کی تثنیہ اور جمع بھی ہوتی ہے اور اُن اسماء کو مؤنث اور مذکر بنایا جا سکتا ہے۔ عربی زبان کا اصول ہے کہ موصوف کی جنس اور عدد کے مطابق صفت بیان کرنے والے لفظ کی جنس اور عدد ہو گا۔ اگر "ٱلرَّحۡمَـٰنُ" ذاتی نام کی بجائے صیغہ صفت ہوتا تو اس لفظ کی جمع بھی ہوتی اور اس کے مقابل مؤنث لفظ بھی ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہے کیونکہ یہ ہستی کا ذاتی نام ہے۔
عربی زبان کے مرکب اضافی میں پہلا اسم یعنی مضاف اسم معرفہ/ذاتی نام نہیں ہوتا۔ اسم ذات ہمیشہ مضاف الیہ ہوتا ہے۔ قرءانِ مجید کے غیر تمام کتابوں اور تحریروں میں بھی اللہ تعالیٰ کا اسم ذات "ٱلرَّحۡمَـٰنُ" کبھی مضاف کی حیثیت میں نہیں ملے گا۔ جیسے۔ عِبَادُ ٱلرَّحۡمَـٰنِ۔ الرحمٰن کے بندے، اگر ہم اس مرکب کا ترجمہ کریں "بڑے/نہایت مہربان کے بندے/غلام" تو اردو کا یہ مرکب مہمل ہو جاتا ہے کیونکہ سننے والا پوچھے گا کہ "بڑے/نہایت مہربان" کون صاحب ہیں۔ اگر کہنے اور سننے والے دونوں ایک ایسے شخص کو جانتے ہیں جس کا ذاتی نام مہربان ہے تو "مہربان کے بندے/غلام" کہا جا سکتا ہے۔

عربی زبان کے سیدھے سادے قواعد سے یہ بات طے ہے کہ "ٱلرَّحۡمَـٰنُ" ذوالجلال والاکرام اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور یہ صفت نہیں مگر ہم تقریباً تمام دستیاب تراجم اور تفاسیر میں اسے صفت کے طور پر لکھا دیکھتے ہیں۔
اکیڈیمک اصول کا تقاضا ہے کہ مترجم کسی بھی کتاب کا ترجمہ کرنے سے پہلے اس میں بیان کردہ اسماء میں ذاتی نام اور دوسرے اسماء میں فرق دیکھے۔ اور ذاتی نام کا ترجمہ نہ کرے

بلکہ اس کو ترجمے کی زبان میں ایسے لکھے جس سے وہی صوت پیدا ہو جو اصل زبان میں نام کی صوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی کسی شخص کے نام کا عربی میں میں ترجمہ کر کے قرء انِ مجید میں نہیں لکھا۔ عجیب اور حیران کن بات ہے کہ مترجمین نے ایک ایسے لفظ کا تعین بھی نہیں کیا جو قرءانِ مجید میں ستاون بار استعمال ہوا ہے کہ وہ اسم ذات (proper noun) ہے یا وصف (adjective)۔

عربی زبان کے قواعد سے قطع نظر جو "اَلرَّحۡمَـٰنُ" کو صرف ذاتی نام ظاہر کرتے ہیں، ہم للہ تعالیٰ کے فرمان کے بموجب آقائے نامدار، رسولِ کریم ﷺ کو اپنے مابین تصور کرتے ہوئے اُن ہی سے رہنمائی لیں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے یا ان کی صفت۔

عام فہم بات ہے کہ مخلوقات میں سے جس ہستی کا قلب و ذہن، انمٹ تحریری نقوش میں ہماری دسترس اور نگاہوں میں ہو، اُن کے متعلق ہم زیادہ دعویٰ اور یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں ہم بخوبی پہچانتے اور جانتے ہیں بہ نسبت اُس شخص کے جو ہمارے ساتھ بشری طور پر موجود رہتا ہے۔ جس ہستی کا باطن ظاہر ہو جائے وہ موجود سے زیادہ موجود ہوتا ہے۔ آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کی مکمل حیات طیبہ، ولادت مبارک سے آخری سانس تک کا تحریری عکس، قرءانِ مجید میں موجود ہے۔ یہ آپ ﷺ کے ذہن و قلب، آپ کے باطن کو ہر لمحہ ہماری نگاہوں کے روبرو رکھتا ہے۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ "اَلرَّحۡمَـٰنُ" ہستی کا ذاتی نام ہے یا ان کی ایک صفت، اسم مبالغہ ہے۔ سوال مُعلِّم سے کیا جاتا ہے۔

اَلرَّحۡمَـٰنُ ۝١

عَلَّمَ ٱلۡقُرۡءَانَ ۝٢

(آگاہ ہو جاؤ) الرّحمن عزوجل نے رسول کریم محمد (ﷺ) کو قرءانِ مجید کی تعلیم دی ہے۔ (الرحمٰن۔ ۱۔ ۲)

عَلَّمَ۔ فعل ماضی واحد مذکر ہے، باب تفعیل اور مصدر تعلیم سے۔ مکمل بیان کے لئے اس کے ساتھ دو مفعول آتے ہیں۔ ایک وہ جسے تعلیم دی گئی اور دوسرا جس بات کی تعلیم دی گئی۔ فعل کے فاعل یعنی معلم الرَّحمٰن سبحانہ وتعالیٰ ہیں اور جنہیں تعلیم دی گئی وہ آقائے نامدار، رسول کریم محمد ﷺ ہیں۔ جس کی تعلیم دی گئی وہ قرءانِ مجید ہے۔ اور ہمارے معلم کون ہیں، ان کے متعلق بتایا:

وَيُعَلِّمُكُمُ ٱلۡكِتَـٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ

اور وہ (رسول امین) تم لوگوں کو ہمارے کلام پر مشتمل کتاب کو پڑھنا لکھنا سکھاتے ہیں اور حکمت، اس میں درج علم کو بروئے کار لانے کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ (حوالہ البقرۃ۔ ۱۵۱)

يُعَلِّمُكُمُ۔ فعل مضارع مرفوع ہے جس میں حال اور مستقبل میں فعل کے وقوع پذیر ہونے اور تسلسل کے معنی ہوتے ہیں۔ یہ بھی باب تفعیل اور مصدر تعلیم سے ہے۔ معلم، آقائے نامدار، رسول کریم محمد ﷺ ہیں۔ جنہیں آپ ﷺ تعلیم دیتے ہیں اس کے لئے جمع حاضر مذکر یعنی مخاطبین کی ضمیر "کُمُ" ہے یعنی آپ اور میں، اور ہر کوئی جو قرءانِ مجید کو پڑھتا ہے اور پڑھے گا۔ اور آپ ﷺ جس کی ہمیں تعلیم دیتے ہیں وہ قرءانِ مجید ہے جو فعل کا دوسرا مفعول بہ ہے۔

جو طالب علم بشری طور پر معلم کے روبرو ہوتے ہیں وہ اگر کسی بات کے متعلق وضاحت چاہتے ہیں تو سوال پوچھ لیتے ہیں جس سے انہیں خود ذہنی طور پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ موجود لوگوں نے معلم سے سوال پوچھے تھے اور انہیں جواب دیئے گئے تھے۔ سوال اور جواب، من و عن انہی لفظوں میں ہمیں تحریراً بتا دیئے گئے ہیں۔ لیکن جو طالب علم بشری طور پر معلم کے روبرو نہیں، اگر اس کے ذہن میں کوئی نیا سوال اٹھتا ہے تو اسے خود کتاب میں جواب تلاش کرنا ہوگا۔

ہستی کا تعارف اور اُس کو یاد کیا جانا اور پکارنا اُس کے مقام و مرتبہ اور ذاتی نام [Personal Name] سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آقائے نامدار، رسولِ کریم ﷺ سے ارشاد فرمایا کہ اِس بات اور نکتے کو ہم لوگوں کو یوں بتائیں اور سمجھائیں:

قُلِ ٱدۡعُواْ ٱللَّهَ أَوِ ٱدۡعُواْ ٱلرَّحۡمَٰنَۖ

آپ(ﷺ)ارشاد فرمائیں ''تم لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا تم لوگ الرّحمٰن کہہ کر پکارو۔

آقائے نامدار ﷺ نے ہمیں بتایا حکم دیتے ہوئے:

1۔ٱدۡعُواْ ٱللَّهَ:اللہ تعالیٰ کو تم لوگ پکارو۔۔(یہ بندوں۔رعایا کا کائنات کے مطلق فرمانروا کو مدد کے لئے پکارنا ہے۔یہ رسمی(formal)انداز ہے)۔۔یا

2۔ٱدۡعُواْ ٱلرَّحۡمَٰنَ۔الرّحمٰن کو تم لوگ پکارو۔(یہ غیر رسمی(informal)۔انداز ہے۔ہر کوئی جرات نہیں کرتا کہ مطلق فرمانروا کو ان کے ذاتی نام سے مخاطب کرے۔)

یہ خطاب کے دو طریقے/آداب ہیں۔رسمی خطاب اس مقام و مرتبہ اور حیثیت کے نام سے ہے جس پر مخاطب فائز ہیں۔اور دوسرا غیر رسمی خطاب ہے جس میں مخاطب ذاتی طور پر ایک اور ایک کے انداز میں مخاطب کو ان کے ذاتی نام سے پکارتا ہے۔

رب العالمین کو ہم اللہ کہہ کر پکاریں یا الرّحمٰن کہہ کر پکاریں۔ان دو ناموں کے درمیان ''اَوِ'' کے معنی ''or،یا'' ہیں،یہ یا اس کے متبادل یہ،اس سے واضح ہے کہ یہ دونوں ذاتی نام(Proper Name)ایک ہستی کے ہیں جو لوگوں کے اِلٰہ ہیں۔اور پھر ان دو ناموں کا ایک ہی ہستی کے ہونے کے متعلق ارشاد فرمایا:

أَيّٗا مَّا تَدۡعُواْ فَلَهُ ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰۚ

جس لمحے بھی تم لوگ طلبگار توجہ ہو تو ان دو میں سے جس نام سے بھی تم پکارتے ہو تو تمہیں بدرجہ اتم تعریف کے حامل اسماء کے ساتھ پکارنا چاہیئے کیونکہ بدرجہ اتم خصوصیات،توازن و حسن،کبریائی کو بیان کرتے اسماء صرف اور صرف ان(الرحمٰن ذالجلال والاکرام)کے لئے مختص اور شایان شان ہیں۔''(حوالہ الاسراء۔۱۱۰)

"أَيّٗا مَّا"اسم شرط ہے اور تنوین کے ساتھ فقط ایک بار استعمال ہوا۔اس کا مضاف الیہ محذوف ہے کیونکہ دونوں نام پہلے بیان ہو چکے جن میں سے ایک ہی ہستی کے ایک نام کو برمحل پسند کر کے وہ دعا کرنا چاہتے ہیں ۔ اس کے دوسری مرتبہ استعمال سے ہمیں معنی اور مفہوم واضح ہو جاتے ہیں اور ماننا پڑتا ہے کہ قرءان مجید خود مترجم بھی ہے:

قَالَ ذَٰلِكَ بَيۡنِي وَبَيۡنَكَۖ

انہوں(موسیٰ علیہ السلام)نے جواب دیا"آپ نے جو کہا وہ میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گیا۔

أَيَّمَا ٱلۡأَجَلَيۡنِ قَضَيۡتُ فَلَا عُدۡوَٰنَ عَلَيَّۖ

ان دونوں مدتوں میں سے جس کسی کو میں نے گزار دیا تو اس صورت میں میرے اوپر کوئی تعزیر نہیں ہو گی۔

وَٱللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٞ ٢٨

اور اللہ تعالیٰ اس پر نگہبان ہیں جو بات ہم طے کر رہے ہیں"۔(القصص۔۲۸)

دوسرے جملے میں ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ مرکب توصیفی ہے۔وصف بیان کرتا دوسرا لفظ اسم تفضیل/superlative ہے۔پہلا اسم جمع ہے۔تمام ایسے اسماء جو بدرجہ اتم تعریف بیان کرنے والے ہیں۔ذاتی نام اسم تفضیل نہیں ہوتے،کیونکہ وہ دو یا دو سے زیادہ کے مابین موازنہ کرتے ہیں،بہتر اور بہترین کا۔

عجب ہے کہ ہمارے قدیم مفسرین، یہودیوں کے اللہ تعالیٰ کے اسم ذات الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام کے متعلق بے سروپا ہرزہ سرائی کو اپنا کر ناموں کے حوالے سے تمام اکیڈیمک اصولوں کو یکسر نظرانداز کر کے الجھاؤ پیدا کرنے میں ان کے ہمنوا بنے اور اسے "اسم مبالغہ" قرار دے کر صیغہ صفت مشہور کر دیا۔ کیا مفسرین نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ جہاں دو ناموں میں سے کسی ایک کو پکارنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے وہاں حکم دیا ہے کہ "ٱلْأَسْمَآءُ ٱلْحُسْنَىٰ" سے الصاق کر کے پکارنا/دعا کرنا ہے؟

وَلِلَّهِ ٱلْأَسْمَآءُ ٱلْحُسْنَىٰ فَٱدْعُوهُ بِهَا ۖ

یاد رکھو کہ بدرجہ اتم مثبت توازن و حسن کی خصوصیات/صفات کا اظہار کرنے والے نام/اسماء صرف اللہ تعالیٰ کیلئے شایان شان ہیں۔ لہٰذا تم لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اِن بدرجہ اتم صفات کے حامل ناموں کے ساتھ پکارو۔

وَذَرُوا۟ ٱلَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِىٓ أَسْمَٰٓئِهِۦ ۚ

اور ان لوگوں کو اپنے حال میں مگن چھوڑ دو جو ان جناب کے ناموں کے بارے میں گستاخی اور کج روی کرتے ہیں۔

سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿١٨٠﴾

عنقریب انہیں اس کی جزا مل جائے گی جو وہ کرتے رہے ہیں۔ (الاعراف۔ ۱۸۰)

---

ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ

اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت جان لو—ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں، سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے۔

لَهُ ٱلْأَسْمَآءُ ٱلْحُسْنَىٰ ﴿٨﴾

بدرجہ اتم خصوصیات، توازن و حسن، کبریائی کو بیان کرتے اسماء صرف اور صرف ان (اللہ تعالیٰ) کے لئے مختص اور شایان شان ہیں۔ (طٰہٰ۔ ۸)

---

هُوَ ٱللَّهُ ٱلْخَٰلِقُ ٱلْبَارِئُ ٱلْمُصَوِّرُ

وہ جناب (الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام) اللہ تعالیٰ ہیں۔ وہ عدم سے مادّیات کو تخلیق کرنے والے ہیں۔ عناصر کو الگ کرنے اور تحفظ دینے والے ہیں؛ وہ جناب ہر شئے کو انوکھی صورت اور چہرہ عنایت کرنے والے ہیں۔

لَهُ ٱلْأَسْمَآءُ ٱلْحُسْنَىٰ ۚ

بدرجہ اتم خصوصیات، توازن و حسن، کبریائی کو بیان کرتے اسماء صرف اور صرف ان (الرحمٰن ذالجلال والاکرام) کے لئے مختص اور شایان شان ہیں۔

يُسَبِّحُ لَهُۥ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ

یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں موجود ہے اور جو کچھ زمین میں موجود ہے ان جناب کو مطلق عظمت و کبریائی اور جدوجہد کا محور اور منزل مقصود قرار دیتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے برسرپیکار ہیں۔

وَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ ﴿٢٤﴾

مطلع رہو؛ ان کے بارے حقیقت یہ ہے کہ وہ جناب دائمی، ہر لحہ، ہر مقام پر مطلق غالب ہیں۔ اور بدرجہ اتم انصاف پسند تمام موجود کائنات کے فرمانروا اور تمام پنہاں کو جاننے والے ہیں۔ (الحشر۔ ۲۴)

قرءان مجید میں الگ سے بھی تحریر ہے کہ خطاب کیسے کرنا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبیوں نے انہیں کیسے مخاطب کیا تھا۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کو کیسے پکارنا ہے اس کے آداب بھی لکھے ہیں۔

قُلِ ٱللَّهُمَّ مَٰلِكَ ٱلْمُلْكِ

آپ (ﷺ) لوگوں سے کہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یوں مخاطب کر کے ان کے حضور یہ اعتراف کریں "ٱللَّهُمَّ! اے تمام سلطنت کے مطلق فرمانروا!

تُؤْتِى ٱلْمُلْكَ مَن تَشَآءُ وَتَنزِعُ ٱلْمُلْكَ مِمَّن تَشَآءُ

یہ آپ ہیں جو کسی خاص علاقے کی حکمرانی پر اسے فائز فرما دیتے ہیں جس کے متعلق یہ فیصلہ فرماتے ہیں؛ اور اس سے اس کی سلطنت کی حکمرانی چھین لیتے ہیں جس کے متعلق یہ فیصلہ صادر کرتے ہیں۔

وَتُعِزُّ مَن تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَآءُ ۖ

اور جس کے متعلق ایسا چاہتے ہیں اسے بلند مقام و حیثیت، صاحب اقتدار، غلبہ و قوت کا حامل بنا دیتے ہیں، اور جس کسی کے متعلق چاہتے ہیں اسے پست و بے توقیر کر دیتے ہیں۔

بِيَدِكَ ٱلْخَيْرُ ۖ

بہترین توازن اور بھلائی پر قائم نظام کو برقرار رکھنا صرف آپ کی قوت فرمانروائی کا مرہون منت ہے۔

إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٦﴾

یقیناً آپ جناب ہر ایک شئے اور معاملے کو پیمانوں میں مقید کرنے پر ہمیشہ سے قادر ہیں۔ (ءال عمران۔ ٢٦)

---

قُلِ ٱللَّهُمَّ

آپ (ﷺ) لوگوں سے کہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یوں مخاطب کر کے ان کے حضور یہ اعتراف کریں "ٱللَّهُمَّ!

فَاطِرَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ

اے آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود پذیر فرمانے والے۔

عَٰلِمَ ٱلْغَيْبِ وَٱلشَّهَٰدَةِ

آپ جناب ان تمام کو ہر لحہ مکمل طور پر جاننے والے ہیں جو دوسروں کی بصارتوں اور بصیرت سے پنہاں اور اوجھل ہے اور جو کچھ ظاہر اور قابل ادراک ہے۔

أَنتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِى مَا كَانُوا۟ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٤٦﴾

آپ جناب ہیں جو روز قیامت اپنے بندوں کے مابین فیصلہ فرمائیں گے اس حکم کے حوالے سے جس میں وہ باہمی طور پر اختلاف کرتے رہے۔ (الزمر۔ ٤٦)

اس انداز تخاطب اور اعترافات سے ہم یہ اظہار کرتے ہیں کہ ہم فلسفہ توحید کے نظریئے پر کاربند ہیں اور یہ کہ بندگی "إِلَٰهًا وَٰحِدًا" کی ہے۔ آقائے نامدار ﷺ کے عالمی رسول مبعوث ہونے سے قبل انفرادی قوموں کی جانب مبعوث فرمائے جانے والے آخری رسول کا انداز تخاطب بھی یہی تھا:

قَالَ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ

عیسیٰ(علیہ السلام)،ابن مریم(صدیقہ) نے کہا:

ٱللَّهُمَّ رَبَّنَآ أَنزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ ٱلسَّمَآءِ

"ٱللَّهُمَّ! ہمارے رب! آپ جناب ہمارے پر یکبارگی آسمان سے اترتا دکھائی دیتے ہوئے خوان میں سجا تناول بھیج دیں۔(حوالہ المائدہ۔ ١١٤)

اللہ تعالیٰ سے آداب تخاطب کے جزیرہ عرب کے مشرکین بھی واقف تھے:

وَإِذْ قَالُواْ ٱللَّهُمَّ إِن كَانَ هَـٰذَا هُوَ ٱلْحَقَّ مِنْ عِندِكَ

ان کی لوگوں پر اثرانداز ہونے کے لئے نفسیاتی جعل سازیوں کے متعلق بھی جان لو جب انہوں نے کہا "ٱللَّهُمَّ! اگر یہ (قرءان مجید) ان کے کہنے کے مطابق آپ کی جانب سے بھیجا ہوا بیان حقیقت ہے۔

فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ ٱلسَّمَآءِ أَوِ ٱئْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٢﴾

تو چونکہ ہم اسے اس کا اختراع کردہ مسودہ قرار دے رہے ہیں اس لئے ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کردے یا ہم پر کوئی دردناک عذاب مسلط کر دے"۔(الانفال۔ ٣٢)

آخرت میں جنت کے باسی دنیا میں اختیار کئے انداز تخاطب پر قائم رہیں گے؛ بتایا:

دَعْوَىٰهُمْ فِيهَا سُبْحَـٰنَكَ ٱللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَـٰمٌ ۚ

ان کا ان میں رہتے ہوئے طرز عمل اس دعا سے ہوگا "آپ جناب عظیم ہیں! تمام عظمت و کبریائی اور جدوجہد کا محور آپ جناب ہیں، ٱللَّهُمَّ!"۔ اور ان میں رہتے ہوئے باہمی ملاقاتوں پر ایک دوسرے کے لئے نیک خواہشات اور خیر سگالی کا اظہار کریں گے۔

وَءَاخِرُ دَعْوَىٰهُمْ أَنِ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَـٰلَمِينَ ﴿١٠﴾

اور آخر میں جدا ہوتے وقت ان کے الفاظ یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرما دیا گیا ہے۔(سورۃ یونسؑ۔ ١٠)

اللہ تعالیٰ کے منفرد اور یکتا نام "ٱلرَّحْمَـٰنُ" سے ابتدا کر کے اللہ تعالیٰ اور قرءانِ عظیم کے حکم کی تعمیل اور رسولِ کریم ﷺ کی اتباع کا شرف ہم نے حاصل کیا ہے کہ انہوں نے بھی قرءانِ مجید کو ایسے ہی پڑھنے کی ابتدا کی تھی جب انہیں پیش کئے جانے پر یہ کہا گیا تھا:

ٱقْرَأْ بِٱسْمِ رَبِّكَ ٱلَّذِى خَلَقَ ﴿١﴾

[جبرئیل علیہ السلام نے پیغام اور کتاب پیش کرتے ہوئے کہا] "آپ (ﷺ) اپنے رب کے منفرد اسم ذات (الرّحمٰن) سے ابتدا فرماتے ہوئے اِس کتاب کو پڑھیں؛ وہ جناب وہ ہستی ہیں جنہوں نے مادی عالم کو تخلیق فرمایا ہے۔(العلق۔ ١)

عام فہم بات اور ہمارا ادراک یہ ہے کہ کسی بھی شئے کے خالق اور تخلیق کردہ کے مابین تعلق رب اور بندے/غلام کا ہوتا ہے۔ تخلیق کرنے والے رب کے مخصوص نام کے ساتھ پڑھنے کیلئے کہا گیا اور پڑھا تحریر کو جاتا ہے۔ ٱقْرَأْ۔ یہ جملہ ایک منظر دکھا رہا جس میں متکلم اور مخاطب موجود ہیں۔ فعل متعدی ہے جس کا مفعول محذوف ہے کیونکہ کتاب کو پیش کرتے ہوئے اسے پڑھنے کا کہا جا رہا ہے۔ "رب" تعلق کا اظہار کرتا ہے خالق کا نام (Proper name) نہیں۔

تمام اشیاء اور مخلوقات کے نام رکھے جاتے ہیں۔ انہیں نام دیئے جاتے ہیں۔

وَإِنِّى سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ

اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔(حوالہ ءال عمران۔۳۶)

---

يَـٰزَكَرِيَّآ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَـٰمٍ ٱسْمُهُۥ يَحْيَىٰ

اے زکریّا(علیہ السلام)! ہم جناب آپ کو ایک بیٹا عطا کرنے کی خوشخبری دیتے ہیں۔اس کا نام یحییٰ ہے۔

لَمْ نَجْعَل لَّهُۥ مِن قَبْلُ سَمِيًّا ۝٧

ہم نے اُس کی خاطر زمانہ قبل میں کسی کے لیئے یہ نام مقرر نہیں کیا۔(مریم۔۷)

اللہ تعالیٰ نے ذاتی نام "ٱلرَّحْمَـٰنُ" خود اپنے لئے پسند فرمایا ہے۔یہ یکتا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔یہ عربی زبان کا نام ہے۔اور قرءانِ مجید بھی عربی زبان میں ہے جس کے متعلق فرمایا کہ یہ آپ ﷺ کی زبان میں ہے،اور پھر آپ ﷺ سے اپنے نام "ٱلرَّحْمَـٰنُ" (ذوالجلال والاکرام) کے متعلق سوال کیا:

هَلْ تَعْلَمُ لَهُۥ سَمِيًّا

کیا آپ (ﷺ) اُن (الرَّحمٰن) کے نام کی کوئی نظیر جانتے ہیں؟(حوالہ مریم۔۶۵)

هَلْ۔حرف استفہام ہے جو جملے میں بیان کردہ بات کی تصدیق چاہتا ہے کہ یہ حقیقت ہے یا نہیں۔یارب! آپ جناب کے حبیب سے زیادہ کون جانتا ہے کہ آپ کے اسم مبارک کی کوئی نظیر نہیں۔یارب! آپ جناب کا میرے آقا کی زبان میں یہ نام پسند فرمانا اور پھر انہی سے پوچھنا،، ہمیں بھی بہت کچھ ظاہر کر گیا ہے کہ محبت اور قربت کی اوج کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام میں مختلف موضوعات پر گفتگو میں ہم دیکھیں گے کہ "ٱلرَّحْمَـٰنُ" (ذوالجلال والاکرام) ذاتی نام ہے،صفت نہیں۔

ا۔معبود کا نام ہوتا ہے جس سے انہیں پکارا جاتا ہے۔

انسان جس کسی کو معبود سمجھتا ہے،اگر وہ حقیقت میں موجود نہیں تو بھی انہیں ایک نام دے کر ہست کرتا ہے۔معبود،جس کی عبادت کی جائے،جس کی بندگی کی جائے،جس کا ہر حال میں ادب واحترام کیا جائے،اس کے لئے عربی میں ماخذ "ء ل ہ" اور اسم جنس/نوع (common noun - having sort, genus) إِلَـٰهٌ۔ واحد؛تثنیہ "إِلَـٰهَيْنِ" اور جمع "ٱلْأَلِـهَةَ"۔عربی زبان کے یہ الفاظ خود باآواز بلند بتا رہے ہے کہ دنیا میں لوگ "إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ" معبود مطلق؛واحد اور یکتا معبود؛"إِلَـٰهَيْنِ" دو معبود ماننے والوں کے علاوہ "ٱلْأَلِـهَةَ" تین اور تین سے زیادہ معبودان کو ماننے والے موجود رہے اور ہیں۔اول مرتبہ یہ "إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ" استعمال ہوا ہے:

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ ٱلْمَوْتُ

(یہ جو برادران یوسف علیہ السلام کے خلاف باتیں کرتے رہتے ہو) بتاؤ کیا تم لوگ اس وقت وہاں موجود تھے جب طبعی موت کا وقت یعقوب (علیہ السلام) کو آن پہنچا تھا؛

إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ

جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنۢ بَعْدِى

"میرے طبعی موت مرنے کے بعد تم کس کی بندگی کروگے؟"

قَالُواْ نَعْبُدُ إِلَـٰهَكَ وَإِلَـٰهَ ءَابَآئِكَ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ وَإِسْحَـٰقَ إِلَـٰهًا وَٰحِدًا

انہوں (بیٹوں؛یوسف علیہ السلام اوران کے برادران) نے جواب دیا" ہم بندگی کریں گے آپ کے اِلٰہ/معبود مطلق،اور آپ کے آباء/باپ دادا ابراہیم،اسماعیل اوراسحاق (علیہم السلام) کے اِلٰہ،وہ یکتا معبود مطلق ہیں۔

وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُونَ ۝١٣٣

اور ہم اُن کیلئے ان کے بنائے آئین پر کاربند رہنے والے مسلمان ہیں"۔(البقرۃ۔۱۳۳)

بندگی "إِلَـٰهًا وَٰحِدًا" کی ہے۔اوراس کے دوسری مرتبہ استعمال میں قرءان مجید کے تمام مخاطبین کو بتایا کہ اُن کے جو "إِلَـٰهٌ" ہیں وہ "إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ" ہیں اور پھر ان کے متعلق خبر دیتے ہوئے ان کا اسم گرامی جلال وقدر بتایا:

وَإِلَـٰهُكُمْ إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ ۖ

اور یہ حقیقت ہمیشہ مد نظر رہے کہ تم لوگوں کے معبود فقط معبود مطلق ہیں۔

لَّآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ

ان تمام کے متعلق جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے مبنی بر حقیقت خبر یہ ہے کہ ان میں کوئی ذی حیات نہیں،سوائے ان واحد معبود مطلق کے۔

ٱلرَّحْمَـٰنُ ٱلرَّحِيمُ ۝١٦٣

وہ معبود مطلق الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) ہیں جو منبع رحمت ہیں۔(البقرۃ۔۱۶۳)۔

مخاطبین کے "إِلَـٰهٌ" کے متعلق پہلی خبر دی "إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ"۔اور دوسری خبر دی جو "إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ" کو متبین کرتی اور "ٱلْأَٓلِهَةَ" سے منفرد یکتا نام بتاتا ہے:

"لَّآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ"۔یہ مکمل جملہ ہے۔"لَآ" حرف نفی "النَّافِيَةُ لِلْجِنْس" ہے۔اس کی نظری پہچان ہے کہ اس کے بعد بیان کردہ اسم ہمیشہ نکرہ اور منصوب ہوتا ہے اور تنوین نہیں ہوتی۔اور وہ اسم لَا کہلاتا ہے۔یہ اپنے اسم کے حوالے سے مطلق نفی کرتا ہے۔مطلق نفی کا مطلب ہے کہ اس کا اسم جس جنس/نوع(species) سے تعلق رکھتا ہے اس میں موجود ہر ایک ایک جزو کی مکمل،یکسر نفی کرتا ہے۔اس طرح ایسا کوئی لفظ اس کا اسم نہیں ہو سکتا جو جنس/نوع کا حامل نہیں۔اس حرف کی خبر اگر ایک لفظ سے بیان ہو تو وہ مرفوع ہوتا ہے۔ عموماًاس کی خبر محذوف ہوتی ہے۔یہاں بھی محذوف ہے جس کے بعد اس خبر سے حرف حصر/استثناء "إِلَّا" مُفَرَّغٌ ہے یعنی جس سے حصر دیا گیا وہ بیان نہیں ہوا۔اوراس کے بعد ضمیر منفصل واحد مذکر جسے محذوف خبر سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ضمیر راجع ہے مبتداء "إِلَـٰهُكُمْ" کو۔ضمیر میں ہر قاری (مذکر،مؤنث) انفرادی اور اجتماعی طور پر شامل ہیں۔ان تمام کو "إِلَـٰهُكُمْ" کے متعلق بتایا کہ "" "إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ" ہیں۔مگر قاریوں کی اکثریت کے لئے بات ابھی بھی نامکمل ہے۔

ہر ذی عقل جانتا ہے کہ "إِلَـٰهٌ" کا اسم ذات اُس کا جزو لاینفک ہے۔اقتدار اور سلطنت کے فرمانروا کا اُس کی حیثیت ومقام بیان کرنے والے نام کے علاوہ لازماً ذاتی نام بھی ہے۔ایک مثال؛قرءان مجید میں موسیٰ علیہ السلام کے نام کے بعد جو ایک سو چھتیس مرتبہ استعمال ہوا کثرتِ استعمال میں دوسرا نام فرعون ہے جو چوہتر مرتبہ استعمال ہوا۔یہ اس کا ذاتی نام نہیں بلکہ مصر کے بادشاہ/حکمران کا ٹائٹل ہے جو کبھی (یوسف علیہ السلام کے دور میں) مصر کے ملک/حکمران کے محل کا نام تھا جس کو بعد میں مطلق العنان

حکمرانی کا مظہر سمجھ کر بادشاہ کا ٹائٹل بنالیا گیا۔ کوئی تو وجہ ہو گی اس دور کے "سیانوں" کے لئے اس کو ٹائٹل کے طور منتخب کرنے میں۔ غور کریں یہ ٹائٹل ہی اس کے عقل و خرد کو لے ڈوبا اور تمام حکمرانوں میں سب سے احمقانہ دعویٰ کر بیٹھا کہ اپنے آپ کو اعلیٰ رب کہا اور لوگوں کو دھمکی دی کہ جس کسی نے "إِلَـٰهًا غَيۡرِى" کو اختیار کیا جیل میں ڈال دیا جائے گا (الشعراء۔29)

اللہ تعالیٰ کے بلاغت کی منتہاؤں کو چھونے والے انداز بیان میں ہر ایسے قاری کے لئے بھی مکمل بات ہے جو لسانیات کی نفاستوں سے لاعلم ہے۔ درمیان کے جملہ "لَآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ" کو ماہرین گرائمر جملہ معترضہ بھی تصور کر سکتے ہیں اور اس کے بعد کے جملہ اسمیہ میں "إِلَـٰهُكُمۡ" کے متعلق تیسری خبر میں نام بتایا: "ٱلرَّحۡمَـٰنُ"۔ یہ جملہ کی خبر ہے جس کا مبتداء "هُوَ" محذوف ہے جو راجع ہے "إِلَـٰهُكُمۡ" کو۔ اور "ٱلرَّحِيمُ" مرکب توصیفی میں الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام کی صفت ہے۔ اس طرح اس جملے کا عربی میں ترجمہ ہے: "إِلَـٰهُكُمۡ ٱلرَّحۡمَـٰنُ ٱلرَّحِيمُ" تم لوگوں کے معبود، جو "إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ" یعنی مطلق اور یکتا ہیں، الرّحمٰن (عزوجل) ہیں جو منبع رحمت ہیں۔

الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام کو "إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ" ماننے والوں کے علاوہ لوگ جن کو "إِلَـٰهَيۡنِ" اور "ٱلۡأَلِـٰهَةَ" مانتے ہیں ان کے متعلق "لَآ" کی محذوف خبر کیا ہے؟ قرءانِ مجید میں ربط و تسلسل بیمثال ہے۔ تیسرے مقام پر جب "إِلَـٰهٌ" استعمال فرمایا تو اس جملے "لَآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ" کو مبتداء "اللہ" کی اول خبر بنا کر ظاہر کر دیا کہ "إِلَـٰهٌ وَٰحِدٌ" کو بیان کرنے کے لئے منفرد اسم "اللہ" ہے۔ اور "لَآ" کی محذوف خبر کو بھی بتا دیا۔ ارشاد فرمایا:

ٱللَّهُ لَآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ

اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت جان لو—ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں، سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے۔ (یہ جملہ ءال عمران۔1؛ النساء۔87؛ طٰہٰ۔8؛ النمل۔26؛ القصص۔70؛ التغابن۔13 میں بھی ہے)

ٱلۡحَىُّ ٱلۡقَيُّومُ

وہ (اللہ تعالیٰ) کامل حیات ہیں، اور وہ تمام نظام کو سنبھالنے اور قائم رکھنے والے مقتدر اعلیٰ ہیں۔

لَا تَأۡخُذُهُۥ سِنَةٌ وَلَا نَوۡمٌ

اونگھ اور نہ ہی نیند کبھی بھی ان پر غالب آسکتی ہے۔

لَّهُۥ مَا فِى ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلۡأَرۡضِ

جو کچھ آسمانوں میں موجود ہے اور جو کچھ زمین میں موجود ہے وہ تمام ان جناب کے لئے نگیں ہیں۔

مَن ذَا ٱلَّذِى يَشۡفَعُ عِندَهُۥٓ إِلَّا بِإِذۡنِهِۦ

کون ہے جو ان کے حضور سفارش و وکالت کر سکے گا۔ کوئی نہیں کر سکے گا۔ استثنا صرف اسے حاصل ہے جس کے لئے ان جناب کا اذن ہے۔

يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ أَيۡدِيهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ

وہ جناب ہر اس بات کا مکمل علم رکھتے ہیں جو ان کے حال اور ماضی میں ہے اور جو ان کے مستقبل میں پنہاں ہے۔

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيۡءٖ مِّنۡ عِلۡمِهِۦٓ إِلَّا بِمَا شَآءَۚ

اور وہ ان کے منبع علم میں سے کسی شئے اور معاملے سے متعلق معلومات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ ماسوائے اس کے جو انہوں نے دینا چاہا تھا۔

وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَۖ

ان کا اقتدار آسمانوں اور زمین سے وسیع تر ہے۔

وَلَا يَـُٔودُهُۥ حِفۡظُهُمَاۚ

ان دونوں کی حفاظت اور نگہبانی کبھی بھی ان کے لئے موجب تھکاوٹ اور گراں نہیں ہوتی۔

وَهُوَ ٱلۡعَلِيُّ ٱلۡعَظِيمُ ٢٥٥

آگاہ رہو؛ وہ جناب اپنے آپ میں لازوال عالی مقام ہیں؛ ابدی عظیم ترین ہیں۔ (البقرۃ۔ ۲۵۵)

یہ ایک فریم/فصل/پیراگراف کی مانند جملہ ہے جس میں مبتداء "ٱللَّهُ" کے متعلق کئی خبریں ہیں۔ پہلی خبر وہی جملہ ہے جس کا مطالعہ کر چکے۔ دوسری خبر بھی ایک جملہ اسمیہ میں دی گئی ہے جس کا مبتداء "هُوَ" محذوف ہے جو راجع ہے مبتداء "ٱللَّهُ" کو۔ ان کے متعلق پہلی خبر "ٱلۡحَيُّ" صفت مشبہ کے صیغہ سے بیان ہوئی جو لفظ کے معنی کو اس کا جز لاینفک اور دائم صفت بنا دیتا ہے جس سے منسوب ہے۔ اور مبتدا کی دوسری خبر "ٱلۡقَيُّومُ" سے بیان فرمائی جو اسم مبالغہ ہے۔ چوتھی بار بھی "إِلَٰهٌ" اس خبر کی تکرار کے لئے استعمال ہوا ہے:

ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ

اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت جان لو—ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں، سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے۔

ٱلۡحَيُّ ٱلۡقَيُّومُ ٢

وہ (اللہ تعالیٰ) کامل حیات ہیں، اور وہ تمام نظام کو سنبھالنے اور قائم رکھنے والے مقتدر اعلیٰ؛ دائم، قائم بالذات، بلا مبالغہ ہمیشہ سے اور ہمیشہ موجود رہنے والے ہیں۔ (آلِ عمران۔ ۲)

الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام کو "إِلَٰهُكُمۡ وَٰحِدٞ" ماننے والوں کے علاوہ لوگ جن کو "إِلَٰهَيۡنِ" اور "ٱلۡأٓلِهَةَ" مانتے ہیں ان کے متعلق "لَآ" کی محذوف خبر کے متعلق مزید جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرءان مجید نے جس کو سب سے اول محذوف ظاہر کیا وہ "ٱلۡحَيُّ" ہے اور دوم "ٱلۡقَيُّومُ" ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی "ٱلۡقَيُّومُ" جبھی ہوگا اگر پہلے سے "ٱلۡحَيُّ" ہے۔ اس طرح واضح ہوا کہ سب سے اول جس کو "لَآ" کی محذوف خبر مانا جاسکتا ہے وہ "حَيٌّ" ہے۔ اور اس کو شامل کر کے جملہ یوں ہوگا "ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ حَيٌّ إِلَّا هُوَ" اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت جان لو۔ ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں، سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے۔ اور اس جملے میں "لَآ" کی محذوف خبر مانا جاسکتا ہے وہ "قَيُّومٌ" ہے۔ اور اس کو شامل کر کے جملہ یوں ہوگا "ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ قَيُّومٌ إِلَّا هُوَ" اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت جان لو۔ ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی دائم، قائم، تغیر و تبدل سے منزا اور ہمیشہ موجود رہنے والا نہیں ہے، سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے۔

پانچویں بار "إِلَٰهٌ" کے استعمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے متعلق مزید خبریں دیکھتے ہیں:

هُوَ ٱلَّذِى يُصَوِّرُكُمْ فِى ٱلْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۚ

وہ جناب ہی ہیں جو تم لوگوں کو ماؤں کے رحم میں موجودگی کے دنوں میں انوکھی صورت کا حامل بناتے ہیں, جس طرح کے چہرے کے خدوخال وہ چاہتے ہیں۔

لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ

اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت جان لو—ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں، سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے۔

ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ ﴿٦﴾

وہ جناب دائمی، ہر لمحہ، ہر مقام پر حتمًا غالب ہیں۔ اور بدرجہ اتم انصاف پسند تمام موجود کائنات کے فرمانروا اور تمام پنہاں کو جاننے والے ہیں۔ (ءال عمران۔٦)

مبتداء "هُوَ" راجع ہے اللہ تعالیٰ کو قبل ازیں آیت سے۔ اس مرتبہ ان کے متعلق پہلی خبر پلٹ ترتیب سے اسم مبالغہ "ٱلْعَزِيزُ" اور پھر صفت مشبہ "ٱلْحَكِيمُ" سے بیان ہوئی ہے۔ اور "ٱلْحَىُّ" اور "ٱلْقَيُّومُ" کی مانند چھٹی اور ساتویں بار "إِلَٰهٌ" کے استعمال پر "ٱلْعَزِيزُ" اور "ٱلْحَكِيمُ" تکرار ہے:

شَهِدَ ٱللَّهُ

اللہ تعالیٰ اس پر گواہ ہیں

أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ

کہ ان جناب کے متعلق حقیقت ہے کہ ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں، سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے۔

وَٱلْمَلَٰٓئِكَةُ وَأُو۟لُوا۟ ٱلْعِلْمِ

اور ملائکہ اور صاحبان علم اس حقیقت پر گواہ ہیں۔

قَآئِمًۢا بِٱلْقِسْطِ ۚ

وہ جناب ہر لمحہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے نظام کائنات کو برقرار رکھتے ہیں۔

لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ

اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت جان لو—ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں، سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے۔

ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ ﴿١٨﴾

وہ جناب دائمی، ہر لمحہ، ہر مقام پر حتمًا غالب ہیں۔ اور بدرجہ اتم انصاف پسند تمام موجود کائنات کے فرمانروا اور تمام پنہاں کو جاننے والے ہیں۔ (ءال عمران۔١٨)

اور آٹھویں بار بھی "إِلَٰهٌ" کے استعمال پر "ٱلْعَزِيزُ" اور "ٱلْحَكِيمُ" کی تکرار ہے:

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ ٱلْقَصَصُ ٱلْحَقُّ ۚ

(آپ لوگ مطمئن رہیں) یقیناً یہ جو تم بیان کرو گے، بلاشبہ وہ لفظ بلفظ ناقابل تردید حقیقت پر مبنی قصہ ہے۔

وَمَا مِنۡ إِلَٰهٍ إِلَّا ٱللَّهُۚ

اور ان تمام کے تمام میں سے کوئی ایک بھی صاحب حیات نہیں جنہیں لوگ معبود قرار دیتے ہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے۔۔

وَإِنَّ ٱللَّهَ لَهُوَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلۡحَكِيمُ ٦٢

اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت ہے کہ بلاشبہ وہ جناب دائمی، ہر لمحہ، ہر مقام پر حتماً غالب ہیں۔ اور بدرجہ اتم انصاف پسند تمام موجود کائنات کے فرمانروا اور تمام پنہاں کو جاننے والے ہیں۔۔ (ءال عمران۔ ٦٢)

ہم نے ابھی تک ان آیات مبارکہ میں بلاغت کے حسن و رعنائیوں کے متعلق بات نہیں کی کیونکہ ہم موضوع تک محدود رہنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ زیر مطالعہ جملے "ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ" کو "لَآ" حرف نفی "لِلْجِنْسِ" کی بجائے حرف نفی "مَا" سے شروع کر کے مبتداء کو محذوف کر دیا جو جار و مجرور "مِنۡ إِلَٰهٍ" سے متبین ہو گا۔ حرف جر "مِنۡ" کا اسم "إِلَٰهٍ" واحد ہے جس سے واضح ہے کہ توکیدی ہے اور واحد اسم میں تمام میں سے کوئی ایک بھی نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ اس طرح اب نہ صرف "لَآ" کی محذوف خبر کا تعین کرنا ہے بلکہ اس جملے کے محذوف مبتداء کو بھی۔ ارشاد فرمایا:

هُوَ ٱلۡحَيُّ

وہ جناب (اللہ؛ رب العالمین) کامل حیات ہیں۔

لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ

اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت جان لو—ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں، سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے۔

فَٱدۡعُوهُ مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَۗ

چونکہ ان حقائق سے کوئی صاحب عقل بے بہرا نہیں اس لئے تم لوگ ان جناب کو پکارو اُن کے متعین کردہ آئین اور ضابطہ حیات/دین (اسلام) کے ساتھ مخلصانہ یکسوئی سے وابستہ رہتے ہوئے۔

ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ٦٥

(اور اقرار کرو) اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرما دیا ہے [احمد ﷺ نے]۔ (غافر۔ ٦٥)

اللہ تعالیٰ نے بتایا وہ از خود سے حیات ہیں اور دوسرے "إِلَٰهَيۡنِ" اور "ٱلۡأَلِهَةَ" کے متعلق جنہیں لوگ معبودان گردانتے اور پکارتے ہیں مطلع فرمایا:

وَٱلَّذِينَ يَدۡعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ لَا يَخۡلُقُونَ شَيۡـٔٗا

متنبہ رہو اور خود بھی مشاہدہ کر لو؛ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسروں کو بھی معبودان سمجھ کر پکارتے رہتے ہیں وہ معبودان کسی بھی شئے کو تخلیق نہیں کرتے۔

وَهُمۡ يُخۡلَقُونَ ٢٠

وہ ان کو باوجود اس حقیقت کے معبودان سمجھتے ہیں جنہیں تخلیق/وجود دیا جاتا ہے۔

أَمۡوَٰتٌ غَيۡرُ أَحۡيَآءٖۖ

اللہ تعالیٰ کے علاوہ وہ تمام جنہیں معبود ان مانا جاتا ہے مادہ اور مردہ ہیں، ذی حیات کے متضاد۔

وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿٢١﴾

اور نہ ہی ان معبودان کو شعور ہے کہ کب انہیں از سر نو وجود پذیر کیا جائے گا۔

إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ

اور یہ حقیقت ہمیشہ مد نظر رہے کہ تم لوگوں کے معبود فقط معبود مطلق ہیں۔

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُم مُّنكِرَةٌ

چونکہ معبودان بنانا مفاد دنیا کا تقاضا ہے اس لئے وہ لوگ جو آخرت کو مانتے ہی نہیں ان کے قلوب معبود کو مطلق ماننے سے منکر ہیں۔

وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ ﴿٢٢﴾

اس حال میں کہ خود ساختہ بڑائی و عظمت کا اظہار اور منوانے کے خواہش مند ہیں۔(النحل۔ ۲۲)

اللہ تعالیٰ، الرَّحمٰن ذوالجلال والاکرام کے علاوہ وہ تمام جنہیں معبودان، "إِلَٰهٌ"؛ "إِلَٰهَيْنِ" اور "الْآلِهَةَ" متصور کیا جاتا ہے، بشمول عیسیٰ علیہ السلام، ابن مریم، وہ تمام مادہ اور مردہ ہیں، ذی حیات سے الگ حیثیت کے حامل۔ مطلق معبود اللہ تعالیٰ، الرَّحمٰن ذوالجلال والاکرام الْحَيُّ ہیں۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ

اور آپ (ﷺ اپنے بعد ذکر کی حفاظت کے متعلق) اُن ایک زندہ پر بھروسہ کریں جو کبھی مریں گے نہیں۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ

اور آپ (ﷺ ان جناب کی عظمت و برتری کی حمد کرتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے تگ و دو فرماتے رہیں۔

وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا ﴿٥٨﴾

اور وہ جناب اپنے بندوں کی لغزشوں اور الزام تراشیوں کا شمار رکھنے کے لئے کافی ہیں، باخبر انداز میں۔(الفرقان۔ ۵۸)

لوگوں نے زمان و مکان میں بہت سے معبود اختراع کئے اور ان کے تخیلاتی نام رکھے۔ اس گمراہ کن فلسفے کی نفی کرتے ہوئے بتایا کہ لوگوں کا معبود فقط معبود مطلق ہے جن کا نام "الرَّحْمَٰنُ" ہے:

مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم

ان جناب کے سوائے اور علاوہ تم لوگ در حقیقت بندگی کسی کی نہیں کرتے مگر محض ناموں کی جو تم لوگوں نے خود سے دیئے ہیں، تم نے اور تمہارے آباؤاجداد نے۔(حوالہ یوسف۔40)

اللہ تعالیٰ کے کلام، منزہ ان مجید کا محور، کلیدی تصور، مرکزی خیال/مقالہ بیان (Thesis Statement) "لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ" ہے۔

جو صاحب حیات نہیں اسے اور انہیں کس منطق اور عقلی دلیل سے لوگ "الْآلِهَةَ" کہتے اور مانتے ہیں؟ ارشاد فرمایا:

وَسۡـَٔلۡ مَنۡ أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِكَ مِن رُّسُلِنَآ

اور آپ (ﷺ) ان سے دریافت کرلیں جنہیں ہم جناب نے آپ سے قبل کے ادوار میں بحثیت رسول بھیجا تھا، یہ آپ ہمارے رسولوں میں سے بعض کی قرءان مجید میں بیان کردہ خبروں/تاریخ سے کریں۔

أَجَعَلۡنَا مِن دُونِ ٱلرَّحۡمَـٰنِ ءَالِهَةً يُعۡبَدُونَ ٤٥

"کیا ہم جناب نے الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) کے علاوہ مادی اشیا اور مُردوں کو معبودان قرار دیا تھا جن کی پرستش کی جاتی ہے؟"۔ (الزخرف۔ ۴۵)

جزیرہ عرب کے مشرکین کے عمائدین اپنے آباؤاجداد کے "دین" یعنی بتوں کی پرستش کے جواز میں اپنے فلسفہ خدائی میں سب سے باعظمت نام کا سہارا لیتے تھے کہ لوگوں کو ان کی شہادت پر یقین آئے۔ اللہ تعالیٰ کے اسم ذات الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام کو اپنے استدلال میں فوقیت دیتے تھے۔ عمائدین مشرکین کے بیانات بتائے:

وَجَعَلُواْ ٱلۡمَلَـٰٓئِكَةَ ٱلَّذِينَ هُمۡ عِبَـٰدُ ٱلرَّحۡمَـٰنِ إِنَـٰثًا

ان کی ہوا میں باتوں پر غور کرو؛ انہوں نے ملائکہ کو جو الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) کے بندے ہیں، مؤنث قرار دے دیا ہے۔

أَشَهِدُواْ خَلۡقَهُمۡ

کیا انہوں نے انہیں تخلیق ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟

سَتُكۡتَبُ شَهَـٰدَتُهُمۡ وَيُسۡـَٔلُونَ ١٩

لوگوں کے سامنے ان کی بیان کردہ شہادت کو ضبط تحریر لایا جاتا رہے گا اور ان سے اس کی بازپرس ہوگی۔

وَقَالُواْ لَوۡ شَآءَ ٱلرَّحۡمَـٰنُ مَا عَبَدۡنَـٰهُم

اور لوگوں کو اصنام پرستی کا جواز بتاتے ہوئے ان عمائدین نے کہا "اگر الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) کا ارادہ ایسا ہوتا تو ہم نے کبھی ان (معبودان) کی بندگی نہ کی ہوتی"۔

مَّا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ

حالانکہ معلومات کا کوئی ذریعہ ان کے پاس قطعاً نہیں ہے جسے وہ تائید میں پیش کرسکیں۔

إِنۡ هُمۡ إِلَّا يَخۡرُصُونَ ٢٠

اور وہ علم و سچائی سے ماورا جھوٹے تخیلاتی قیاسات کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں کرتے۔ (الزخرف۔ ۲۰)

جزیرہ عرب میں سب سے اعلیٰ، ذی عظمت و جلال نام الرّحمٰن تھا اور ہے۔ ان کی منشاء سے اپنے مشرکانہ عقائد اور پرستش کو دلیل اور ثبوت بنایا اور اس کو انتہائی مدلل ظاہر کرنے کے لئے نفی کا جملہ استعمال کیا "مَا عَبَدۡنَـٰهُم"۔

قرءانِ مجید میں معبود مطلق کا نام صرف اللہ تعالیٰ اور "ٱلرَّحۡمَـٰنُ" ذوالجلال والاکرام بتایا گیا ہے۔ اور تمام۔ ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ معبود مطلق کی صفات (epithets) بیان کرتے ہیں۔

---

۲۔ معبود مطلق کی بندگی کرنے والے بندے معبود مطلق کے نام سے بیان ہوتے ہیں، ان کی صفات کے حوالے سے نہیں۔

عام گفتگو میں بھی جب کسی ملازم یا غلام شخص کے مالک کا ہم حوالہ دیتے ہیں تو ہمیشہ مالک کا نام لیتے ہیں، اس کی کسی صفت کے حوالے سے نہیں۔ کسی بھی صفاتی نام کے حوالے

سے کسی کو بندہ نہیں کہا جاتا۔

۔عَبۡدُ ٱللَّهِ۔(حوالہ مریم۔۳۰)

قَالَ إِنِّي عَبۡدُ ٱللَّهِ

(ان کے ناممکن ہونے کے تصور کے جواب میں وہ بول اٹھے)انہوں(گود میں طفل عیسیٰ علیہ السلام)نے کہا"یقیناًمیں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔

ءَاتَىٰنِيَ ٱلۡكِتَٰبَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۝٣٠

انہوں نے مجھے منفرد کتاب کو عنایت کر کے نوازا ہے۔اور انہوں نے مجھے نبیؑ قرار دیا ہے۔(سورہ مریم صدیقہ۔30۔)

۔عِبَادُ ٱللَّهِ۔(حوالہ الانسان۔٦)

۔عِبَادُ ٱلرَّحۡمَٰنِ۔(حوالہ الفرقان۔٦٣)

۔عِبَدُ ٱلرَّحۡمَٰنِ ۔(حوالہ الزخرف۔١٩)

ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ کے حوالے سے کسی کو بندہ نہیں کہا گیا۔اس طرح واضح ہے کہ "ٱلرَّحۡمَٰنُ"اسم علم،اسم ذات ہے۔

---

۳۔معبود مطلق کی پہچان(recognition)رب العالمین ہے۔اور رب العالمین کا نام اللہ تعالیٰ اور "ٱلرَّحۡمَٰنُ"۔ہے:

قرءانِ مجید میں تمام تخلیقات کے رب کو بیان کرنے کے لئے ان کے دو ذاتی نام بیان ہوئے ہیں،اللہ اور "ٱلرَّحۡمَٰنُ" سبحانہ وتعالیٰ۔

تعارف اور پہچان میں فرق ہے۔نام شئے اور ہستی کو متعارف کرنے کے لئے ہیں۔نام(اسم علم)تمام موجودات میں منفرد حوالے کے لئے ہیں۔علم کی ابتدا مفردات، موجودات کے نام سے متعارف ہوتا ہے۔یہ محض اطلاع ہے۔اور شئے اور ہستی کے متعلق جس قدر معلومات کسی کو حاصل ہوں گی اسی تناسب سے وہ شئے اور ہستی اس کے لئے معروف ہو گی،مشہور،شہرت یافتہ (high profile)۔پہچان اور قدر کا تعلق اس شئے اور ہستی کے خواص،حیثیت،مقام و مرتبہ،قدر،قابلیت،رویئے،سلوک اور ان کے اظہار سے ہے۔ان کے حوالے سے شئے اور ہستی کی قدر(recognition)کے پیمانے اور معیار ہے۔تعارف ادراک یعنی جاننے کا عمل(process)ہے جبکہ پہچان تسلیم کرنے کا عمل(Act)ہے یا شناخت کی حالت ہے۔پہچان مثبت یا منفی رد عمل کا باعث ہے۔قدر شناس اور ناقدر دان۔

مَا قَدَرُواْ ٱللَّهَ حَقَّ قَدۡرِهِۦٓ

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے مطلق مقام و مرتبہ کا احساس و ادراک اور احترام اس طرح نہیں کیا جیسا کہ ان کی عظمت و کبریائی کا استحقاق ہے۔

إِنَّ ٱللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝٧٤

اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام قوت کے مطلق مالک اور مکمل طور پر ہر لمحہ ہر مقام پر مطلق غالب ہیں۔(الحج۔۷۴)

اللہ تعالیٰ،الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام کی پہچان اور مقام و مرتبہ کو ہم یوں بیان کرتے ہیں:

ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ۝٢

اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرمادیا ہے [احمد ﷺ نے]۔

وہ موجود و معلوم تخلیق کردہ دنیاؤں/ہر ایک وجود پذیر کے رب ہیں۔(۲)

ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ٣

ہر وجود پذیر کے رب الرّحمن عزوجل ہیں جو منبع رحمت ہیں۔(۳)

---

كَذَٰلِكَ أَرۡسَلۡنَٰكَ فِيٓ أُمَّةٖ قَدۡ خَلَتۡ مِن قَبۡلِهَآ أُمَمٞ

اس طرح ہم جناب نے آپ (ﷺ) کو ان لوگوں کی موجودہ نسل میں رسول مبعوث فرمایا جن کی کئی نسلیں اس سے قبل گزر چکی ہیں (جنہیں کتاب سے نہیں نوازا گیا تھا)۔

لِّتَتۡلُوَاْ عَلَيۡهِمُ ٱلَّذِيٓ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ

تاکہ آپ (ﷺ) انہیں وہ (قرءان مجید) لفظ بلفظ ترتیل کے انداز میں سنائیں جو ہم جناب نے آپ (ﷺ) کی جانب بھیجا ہے۔

وَهُمۡ يَكۡفُرُونَ بِٱلرَّحۡمَٰنِۚ

اور وہ اس حالت میں ہیں کہ الرّحمٰن (عزوجل) کا اِلٰہ واحد ہونے سے مسلسل انکار کرتے رہتے ہیں۔

قُلۡ هُوَ رَبِّي

آپ (ﷺ) ارشاد فرمائیں ''وہ جناب (الرّحمٰن) میرے رب ہیں۔

لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ

اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت جان لو—ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں، سوائے ان (الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام) کے۔

عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَإِلَيۡهِ مَتَابِ ٣٠

ان پر بھروسہ کرتے ہوئے میں اپنے معاملات کو سلجھانا ان پر چھوڑ دیتا ہوں۔اور میرا رجوع کرنا ہر لحہ ان جناب کی جانب ہے''۔(الرعد۔۳۰)

---

وَإِنَّ رَبَّكُمُ ٱلرَّحۡمَٰنُ

(ھارون علیہ السلام نے کہا) اور حقیقت یہ ہے کہ تم لوگوں کے پروردگار الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) ہیں۔(حوالہ طہٰ۔۹۰)

---

رَّبِّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ٱلرَّحۡمَٰنِۖ

آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے مابین موجود ہے ان کے رب الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) ہیں۔(حوالہ النباء۔۳۷)

---

اس طرح واضح ہے کہ الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) اسم علم، اسم ذات ہے۔

۴۔انسان جس سے طلبگار استعانت ہوتا ہے اسے نام سے پکارتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے کلام میں پہلا جملہ دو بار آیا ہے:

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ١

آقائے نامدار رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے اسم ذات الرّحمٰن سے ابتدا ہے جو منبع رحمت ہیں۔(۱)

دوسری بار آیت ۲۷:۳۰ میں مشبہ بالفعل حرف اِنَّ کی محذوف خبر کے متعلق ہے جو سلیمان علیہ السلام کا ایک ملکہ کے نام تحریر کردہ خط (عربی میں کتاب) کا ابتدائیہ، Prologue تھا۔

قَالَتۡ يَٰٓأَيُّهَا ٱلۡمَلَؤُاْ

ان محترمہ (ملکہ سبا) نے کہا" معزز سردارو؛ توجہ کریں۔

إِنِّيٓ أُلۡقِيَ إِلَيَّ كِتَٰبٞ كَرِيمٌ ٢٩

آپ کے علم میں اس حقیقت کو لانا ہے کہ ایک انتہائی نفیس مکتوب کو میرے روبرو پیش کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

إِنَّهُۥ مِن سُلَيۡمَٰنَ وَإِنَّهُۥ

یہ (مکتوب) سلیمان (علیہ السلام) نے مجھے پہنچانے کے لئے بھیجا ہے۔اور اس کا ابتدائیہ یہ ہے:

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ٣٠

"اللہ تعالیٰ کے اسم ذات الرّحمٰن سے ابتدا ہے، وہ جناب منبع رحمت ہیں۔(النمل۔۳۰)

ہر فعل و عمل کو شروع کرنے سے قبل ہم اس جملے سے ابتدا کرتے ہیں۔ہم اس ہستی سے اعانت کے طلبگار ہوتے ہیں جن کے نام اللہ، الرّحمن عزوجل ہیں۔اور جو ہستی تعاون طلب کئے جانے پر معاونت کو خود اپنے لیئے تفویض فرمالے انہیں ٱلۡمُسۡتَعَانُ کہتے ہیں۔قرءان مجید میں ٱلۡمُسۡتَعَانُ اسم فاعل صرف دو بار آیا ہے۔ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اسے بطور خبر بتایا گیا اور دوسری بار الرّحمٰن عزوجل کے متعلق اسے بطور خبر بتایا گیا:

وَٱللَّهُ ٱلۡمُسۡتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ١٨

اور اللہ تعالیٰ ہی ہیں جن سے طلبگار اعانت ہوں اس کے لئے جو بڑھا چڑھا کر جھوٹ تم بیان کر رہے ہو"۔(حوالہ سورۃ یوسفؑ۔۱۸)

---

قَٰلَ رَبِّ ٱحۡكُم بِٱلۡحَقِّۗ

انہوں (رسول کریم ﷺ) نے سلسلہ کلام کو قطع کرتے ہوئے دعا فرمائی "اے میرے رب! آپ مبنی بر حقیقت فیصلہ فرمادیں"۔

وَرَبُّنَا ٱلرَّحۡمَٰنُ ٱلۡمُسۡتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ١١٢

اور انہوں نے مخاطبین سے کہا" ہمارے رب الرّحمن (ذوالجلال والاکرام) ہیں، وہ اعانت فرمانے والے ہیں، ان ہی سے رجوع کیا جاسکتا ہے ان باتوں پر جو تم اپنے تخیل سے بیان کر رہے ہو"۔(الانبیاء۔۱۱۲)

ٱلۡمُسۡتَعَانُ۔معرفہ اسم فاعل باب استفعل (Form-X) میں مصدر استعانۃٌ سے بنا ہے۔اس باب میں اس بات کے طلبگار اور خواہش مند ہونے کے معنی شامل ہوتے ہیں جو اس کے بنیادی باب کے معنی ہیں اور یہ کہ فاعل اس فعل کو از راہ "تکلف" یعنی اپنے آپ پر تفویض کر لیتا ہے۔اس کے بنیادی باب کے معنی اعانت ہیں۔اور اللہ تعالیٰ،

الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام سے مخاطب ہو کر ہم استدعا کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ ۝5

اور صرف آپ ہیں جن سے اپنی شخصیت کو اوجِ ثریا پر لے جانے کیلئے اعانت کے ہم طلبگار ہیں۔(الفاتحہ۔۵)

قرءانِ مجید یہ جملہ ایک بار ہے۔ جملہ فعلیہ کا یہ فعل بھی مصدر استعانۃٌ سے بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ، الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام سے ہم طلبگار اعانت ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو اس کا مکلف بنالیا ہے کہ اعانت کے لئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ، الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام سے رجوع کریں گے۔

---

۵۔ سجدہ ہستی کو کیا جاتا ہے، صفات کو نہیں۔

ہستی یا کسی مخصوص شئے کے لئے تعظیم، عظمت، بڑائی، فرمانبرداری کا احساس اور جذبہ ہوتا ہے جس کے مقابل انسان اپنے آپ کو کمتر، کمزور اور عاجزی کا پیکر سمجھتا ہے۔ اور اس ہستی یا شئے کے لئے یا اس کے روبرو سر تسلیم خم کرتا اور سر بسجود ہوتا ہے۔ تعظیم کا اظہار زبان اور (body language) عمل کی زبان سے کیا جاتا ہے۔ انتہائی عظمت کو تسلیم کرنے اور انتہائی تعظیم کا اظہار سجدے سے کیا جاتا ہے۔

وَإِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلَـٰٓئِكَةِ ٱسۡجُدُواْ لِأٓدَمَ

اور (ان ملائکہ کے رویہ کے متعلق) وقت کے اُس لمحے کی تاریخ بھی جان لو جب ہم جناب نے ملائکہ سے کہا تھا "آدم کیلئے تم سب سرنگوں ہو جاؤ، تعظیم بجالاؤ"۔ (حوالہ البقرۃ۔۳۴)

---

مادی طور پر وجود دیئے جانے والے اولین انسان کا ذاتی نام ءآدم علیہ السلام ہے۔ یہ حکم ان کے وجود پذیر ہونے سے قبل دیا گیا تھا۔ اس قصہ میں استعمال ہوا لفظ سجدہ بھی بعض لوگوں کے لئے باعث الجھن بنتا ہے کیونکہ تمام مترجمین نے ترجمہ یوں کیا "آدم کو سجدہ کرو"؛ "آدم کے آگے سجدہ کرو" جیسے انگریزی کے اولین عیسائی مترجمین نے "prostrate" کیا تھا۔ اس کا ماخذ "س۔ج۔د" ہے جس میں سمویا بنیادی تصور کسی کے مقابل اپنے پست، کمتر، انکساری، عجز کا احساس ہے اور دوسرے کے بلند مقام و مرتبہ کو تسلیم کرتے ہوئے ادب و احترام کرنے کا ایسا جذبہ جس کا جسمانی طور پر اظہار کیا جائے جیسے سر کو تھوڑی کی جانب جھکانا جس سے نگاہیں بھی نیچی ہو جائیں۔ بنیادی معنوں میں یہ ایسے ہی ہے جیسے سلامی کے چبوترے کے سامنے سے پریڈ کرتے ہوئے فوجی افسران اور جوان اپنے ہتھیاروں کو نیچے کی جانب کر کے اپنے جنرل یا اعلیٰ شخصیت کو سلوٹ کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ سجدہ کا اظہار جھکنا اور آخری حد اپنی پیشانی کو زمین پر ٹیک دینا ہے۔ پیشانی کو زمین پر ٹیک دینا اپنی حریت (خلیفہ) سے دستبردار ہو کر اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی صوابدید کے تابع کرنے کا عملی اظہار ہے۔ اور اگر انسان جھک کر اپنی پیشانی کو کسی انسانی پیشوا کے قدموں پر رکھ دے اور سجدہ کروانے والے کا چہرہ فخر سے درخشاں ہو جائے تو دونوں کے دوزخ میں جانے کے امکانات روشن ہو گئے۔

أَلَمۡ تَرَ أَنَّ ٱللَّهَ يَسۡجُدُ لَهُۥ مَن فِى ٱلسَّمَـٰوَٲتِ وَمَن فِى ٱلۡأَرۡضِ

کیا آپ (ﷺ) نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ہیں جن کے لئے جو کوئی آسمانوں میں ذی حیات موجود ہے اور جو کوئی زمین میں ذی حیات موجود ہے دل کی شادسے سر بسجود ہوتا ہے اور نظام کی مجبوری اور ناگواری جبر کے زیر اثر سرنگوں ہوگا۔

وَٱلشَّمۡسُ وَٱلۡقَمَرُ وَٱلنُّجُومُ

اور سورج اور چاند اور ستارے ان جناب کے لئے مطیع سجدہ ریز رہتے ہیں۔

وَٱلۡجِبَالُ وَٱلشَّجَرُ وَٱلدَّوَآبُّ

اور تمام پہاڑ اور تمام درخت اور تمام جانور ان جناب کے لئے مطیع سجدہ ریز رہتے ہیں۔

وَكَثِيرٌ مِّنَ ٱلنَّاسِ ۖ

اور انسانوں میں سے بھی ایک کثیر تعداد ان جناب کے حضور سجدہ ریز ہوتی ہے۔

وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيۡهِ ٱلۡعَذَابُ ۗ

اور جبکہ ان (انسانوں) کی کثیر تعداد پر منفرد عذاب مستوحب ہو گیا ہے۔ (حوالہ الحج۔۱۸)

(یہ آیت مبارکہ آیت سجدہ ہے)۔ آئیں اپنے رب کے سامنے شوق ورغبت سے سر بسجود ہونے کی عادت اپنائیں۔ بابابلھے شاہ نے شاید اسی اطلاع پر تڑپ کر کچھ یوں کہا تھا:
"اُٹھ وے بھلیا سلہ۔۔۔۔۔۔بازی لے گئے نیں کتے"

سجدہ ہستی کو ہے، اور لائق سجدہ ہستی کے نام اللہ تعالیٰ اور الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام ہیں:

إِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتُ ٱلرَّحۡمَٰنِ خَرُّواْ سُجَّدٗا وَبُكِيّٗا ۩ ﴿٥٨﴾

جب الرّحمن (ذوالجلال والاکرام) کی آیات انہیں سنائی جاتی تھیں تو وہ ان کے حضور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ ازخود سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔ (حوالہ مریم۔۵۸)

---

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ٱسۡجُدُواْ لِلرَّحۡمَٰنِ

اور جب ان سے کہا گیا "تم لوگ سجدہ ریز ہو فقط الرّحمن (ذوالجلال والاکرام) کے لئے"

قَالُواْ وَمَا ٱلرَّحۡمَٰنُ

انہوں نے (طنزیہ انداز میں) جواب دیا "کیا؟ فقط الرّحمن؟

أَنَسۡجُدُ لِمَا تَأۡمُرُنَا

کیا ہم سجدہ کریں فقط اس طرح جیسے تو ہمیں حکم دے رہا ہے؟"

وَزَادَهُمۡ نُفُورٗا ۩ ﴿٦٠﴾

اور اس انداز فکر، انداز تکلم نے انہیں بڑھا دیا، فلسفہ توحید سے دوری اور فرار میں۔ (الفرقان۔۶۰)

---

سجدے کے حوالے سے بھی ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرح الرّحمن ذوالجلال والاکرام بھی ذاتی نام (proper noun) ہے۔

---

۶۔ شئے کو بنانے والے خالق کی پہچان اور اس کا حوالہ ہمیشہ نام سے ہوتا ہے چاہے یہ ایک ہستی ہو، چاہے کوئی کمپنی، ادارہ

ہم کسی شئے کو وجود پذیر کرنے والے خالق کا حوالہ اس کی صفات کے حوالے سے نہیں دیتے بلکہ اس کا نام بتاتے ہیں۔

ٱللَّهُ خَٰلِقُ كُلِّ شَيۡءٖ ۖ

اللہ تعالیٰ ہیں جو تمام کے تمام موجودات کے خالق ہیں۔

وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ وَكِيلٞ ﴿٦٢﴾

اور وہ جناب تمام موجودات اور معاملات کی نگرانی اور انجام تک پہنچانے والے ہیں۔(الزمر۔۶۲)

---

ٱلرَّحۡمَـٰنُ ۝١

عَلَّمَ ٱلۡقُرۡءَانَ ۝٢

آگاہ ہو جاؤ)الرّحمن عزوجل نے رسول کریم محمد (ﷺ) کو قرءانِ مجید کی تعلیم دی ہے۔(الرحمٰن۔۱۔۲)

خَلَقَ ٱلۡإِنسَـٰنَ ۝٣

انہوں(الرّحمن عزوجل) نے انسان کو تخلیق فرمایاہے۔(الرحمٰن۔۳)

---

ٱلَّذِى خَلَقَ سَبۡعَ سَمَـٰوَٲتٍ۬ طِبَاقً۬اۖ

(مطلق فرمانروا)وہ جناب ہیں جنہوں نے سات آسمانوں کو تخلیق کیا،طبق در طبق،اوپر تلے باہمد گر انداز میں۔

مَّا تَرَىٰ فِى خَلۡقِ ٱلرَّحۡمَـٰنِ مِن تَفَـٰوُتٍ۬ۖ

الرّحمن(ذوالجلال والاکرام) کی تخلیق میں تم تفاوت،عدم تناسب کہیں نہیں دیکھو گے۔

فَٱرۡجِعِ ٱلۡبَصَرَ هَلۡ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ۬ ۝٣

چونکہ اس بات کامشاہدہ کیاجاسکتاہے اس لئے تم نگاہ کواس پر مرکوز کرکے دیکھو؛بتاؤ کہیں شگاف/دراڑ دکھائی دیتاہے؟(حوالہ الملک۔۳)

---

أَلَمۡ تَرَوۡاْ كَيۡفَ خَلَقَ ٱللَّهُ سَبۡعَ سَمَـٰوَٲتٍ۬ طِبَاقً۬ا ۝١٥

کیاتم لوگوں نے دیکھا/غور نہیں کیاکہ اللہ تعالیٰ نے کیسے سات آسمانوں کو تخلیق کیا،طبق در طبق،اوپر تلے باہمد گر انداز میں۔(سورۃ نوحؑ۔۱۵)

---

تخت حکمرانی پر براجمان ہستی کاحوالہ نام سے دیاجاتاہے۔

ہمارا عام تصور اور طرز عمل ہے کہ ہم اس ہستی کانام لے کر ذکر کرتے ہیں جو تخت حکمرانی پر براجمان اور تشریف فرماہوتے ہیں۔ہم تخت پر جلوہ افروز شخصیت کانام دوسروں کو بتاتے ہیں،ان کی شان اور خصوصیات کاتذکرہ بعد میں کرتے ہیں۔قرءانِ مجید بھی اسی انداز میں تخت پر جلوہ افروز ہستی کانام اللہ تعالیٰ اور الرّحمن(ذوالجلال والاکرام) بتایا ہے:

ٱللَّهُ ٱلَّذِى رَفَعَ ٱلسَّمَـٰوَٲتِ بِغَيۡرِ عَمَدٍ۬ تَرَوۡنَہَاۖ

اللہ تعالیٰ ہیں جنہوں نے آسمانوں کو بلند فرمایا۔اس ارتقاع کی حالت ستونوں کے علاوہ ذریعے سے ہے۔تم لوگ اسے بغیر ستونوں کے بلند دیکھتے ہو۔

ثُمَّ ٱسۡتَوَىٰ عَلَى ٱلۡعَرۡشِۖ

بعدازاں وہ جناب مزید بلندی پر عرش/یکتاتخت اقتدار پر تشریف فرماہوئے۔(حوالہ الرعد۔۲)

---

ٱلرَّحۡمَـٰنُ عَلَى ٱلۡعَرۡشِ ٱسۡتَوَىٰ ۝٥

وہ جناب الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام ہیں جو اعلیٰ آسمانوں کے پار مزید بلندی پر عرش/یکتاتخت اقتدار پر تشریف فرماہیں۔(طہٰ۔۵)

---

ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا فِى سِتَّةِ أَيَّامٍ

اور وہی جناب ہیں جنہوں نے تخلیق فرمایا سات آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین ہے، اس کائنات کے باہر کے وقت کے شمار سے چھ دنوں میں۔

ثُمَّ ٱسۡتَوَىٰ عَلَى ٱلۡعَرۡشِ ۚ

بعد ازاں وہ جناب مزید بلندی پر عرش/یکتا تختِ اقتدار پر تشریف فرما ہوئے۔

ٱلرَّحۡمَـٰنُ فَسۡـَٔلۡ بِهِۦ خَبِيرًا ۝٥٩

اس عظیم الشان تخلیق کے خالق الرّحمن (ذوالجلال والاکرام) ہیں۔ اگر مزید معلومات درکار ہوں تو اس (قرءان مجید) سے اعانت لیں، باخبر حالت میں رہنے کے لئے۔ (الفرقان۔۵۹)

---

ٱللَّهُ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَـٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا فِى سِتَّةِ أَيَّامٍ

اللہ تعالیٰ وہ جناب ہیں جنہوں نے تخلیق فرمایا سات آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین ہے، اس کائنات کے باہر کے وقت کے شمار سے چھ دنوں میں

ثُمَّ ٱسۡتَوَىٰ عَلَى ٱلۡعَرۡشِ ۖ

بعد ازاں وہ جناب مزید بلندی پر عرش/یکتا تختِ اقتدار پر تشریف فرما ہوئے۔ (حوالہ السجدہ۔۴)

---

۸۔ وعدے کے حوالے کے لئے ہم شخصیت کا نام لیتے ہیں جس کا وہ وعدہ ہے۔

یہ بھی ہمارا عام تصور اور طرز عمل ہے کہ ہم اس ہستی کا نام لے کر ذکر کرتے ہیں جس نے کوئی وعدہ کیا ہے۔ قرءانِ مجید میں بھی وعدے کے حوالے سے۔ ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ ۔کا ذکر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ، الرّحمن (ذوالجلال والاکرام)، تمہارے رب کا وعدہ کہا گیا ہے۔

۱۔ وَعَدَ ٱللَّهُ۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے۔ (حوالہ النساء۔۹۵؛ المائدہ۔۹؛ التوبہ۔۶۸ اور ۷۲؛ النور۔۵۵؛ الفتح۔۲۸؛ اور الحدید۔۱۰)

۲۔ وَعَدَ ٱلرَّحۡمَـٰنُ۔ الرّحمن (ذوالجلال والاکرام) نے وعدہ کیا ہے۔ (حوالہ مریم۔۶۲؛ اور یٰسٓ۔۵۲)

۳۔ وَعَدَ رَبُّكُمۡ۔ تم لوگوں کے رب نے وعدہ کیا۔ (حوالہ الاعراف۔۴۴)۔

۴۔ وَعۡدَ ٱللَّهِ۔ (مرکب اضافی) اللہ تعالیٰ کا

وعدہ۔ (ref:4:122;10:4;10:55;13:31;18:21;28:13;30:6;30:60;31:9[31:33;35:5;39:20;40:55;40:77;45:22;46:17)۔

---

۹۔ معاہدہ فریقین کے مابین ان کے نام سے ہوتا ہے۔

قانون کے نکتہ نظر سے باہمی معاہدہ فریقین پر ایک ذمہ داری عائد کرتا ہے جس کی بجاآوری لازم ہے۔ معاہدے کی بنیاد قانونی طور پر دو مختار فریقوں کے مابین باہمی رضامندی سے کسی معاملے میں طے شدہ شرائط پر اتفاق ہے۔ معاہدے کی بنیادی قانونی تعریف سے واضح ہے کہ فریقین کا حوالہ ان کی خصوصیات سے نہیں بلکہ ان کے نام سے ہو گا۔ عربی میں معاہدے کو۔ عَهۡدٌ۔ کہتے ہیں۔

ٱلَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهۡدَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ مِيثَٰقِهِۦ

یہ (فاسقین) وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو اُس کے پابند، بندھے ہونے کے باوجود توڑتے، عہد شکنی کرتے ہیں۔

وَيَقۡطَعُونَ مَآ أَمَرَ ٱللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ

اور یہ لوگ (فاسقین) اس کو قطع کرتے، توڑتے ہیں جس معاملے کو اللہ تعالیٰ نے استوار رکھنے کا حکم دیا ہے۔

وَيُفۡسِدُونَ فِي ٱلۡأَرۡضِۚ

اور یہ لوگ (فاسقین) زمین (معاشرے) میں بگاڑ، بے اعتدالی پیدا کرتے ہیں۔ [متضاد طرز عمل کے لوگ ۱۳:۲۰]

أُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡخَٰسِرُونَ ٢٧

یہ (فاسقین) ایسے لوگ ہیں جو خود اپنا خسارہ/نقصان کرنے والے ہیں۔ [البقرۃ۔۲۷]

---

أَطَّلَعَ ٱلۡغَيۡبَ

اتنا اعتماد کس وجہ سے! کیا اس نے مستقبل میں پنہاں کا کھوج لگا کر اپنے آپ کو مطلع کر لیا ہے؟

أَمِ ٱتَّخَذَ عِندَ ٱلرَّحۡمَٰنِ عَهۡدٗا ٧٨

یا کیا ان کے عنایت کئے جانے کا اس نے الرّحمٰن (عزوجل) کی جانب سے عہد نامہ حاصل کر لیا ہے؟ (سورۃ مریم۔۷۸)

---

لَّا يَمۡلِكُونَ ٱلشَّفَٰعَةَ إِلَّا مَنِ ٱتَّخَذَ عِندَ ٱلرَّحۡمَٰنِ عَهۡدٗا ٨٧

وہ (متقین) حق شفاعت کے مالک نہیں، سوائے ان ایک (محمد ﷺ) کے جنہوں نے الرّحمن (ذوالجلال والاکرام) کی جناب سے اختیارِ شفاعت کا عہد لے رکھا ہے۔ (سورۃ مریم۔۸۷)

---

۱۰۔اجازت، اجازت نامہ، اور اعلان جس ہستی، مقتدر شخصیت کی جانب سے ہوتا ہے اس کا نام بتایا جاتا ہے۔

ہمارے تصور اور تجربے میں یہ عام فہم بات ہے کہ کسی کام اور اختیار رکھنے کی کسی کو اجازت دینے اور اعلان عام میں اس ہستی اور اتھارٹی کا نام لیا جاتا ہے جس کی جانب سے وہ ہے۔ عربی میں اس کے لئے لفظ بِإِذۡنِ ہے یعنی اجازات کے ساتھ۔

۔بِإِذۡنِ ٱللَّهِ۔ (جار و مجرور + مرکب اضافی) اللہ تعالیٰ کی اجازت (اِذن) کے ساتھ۔

وَكَم مِّن مَّلَكٖ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ لَا تُغۡنِي شَفَٰعَتُهُمۡ شَيۡـًٔا

اور آسمانوں میں کتنے ہی ملائکہ ہیں جن کی شفاعت/کرم نوازی کی سفارشی درخواست کسی اِفادہ کا باعث نہیں بنتی۔

إِلَّا مِنۢ بَعۡدِ أَن يَأۡذَنَ ٱللَّهُ لِمَن يَشَآءُ وَيَرۡضَىٰٓ ٢٦

سوائے بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق انہیں اذن دے دیا جس کے متعلق یہ فیصلہ اور رضا کا اظہار فرماتے ہیں۔ (النجم۔۲۶)

---

يَوۡمَ يَقُومُ ٱلرُّوحُ وَٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ صَفّٗاۖ

جس دن جبرئیل (علیہ السلام) اور ملائکہ ایک صف میں کھڑے پیش ہوں گے۔

لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنۡ أَذِنَ لَهُ ٱلرَّحۡمَٰنُ

وہ ازخود سے کلام/خطاب نہیں کریں گے سوائے اس کے جسے الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) اجازت مرحمت فرمائیں گے۔

وَقَالَ صَوَابًا ۝٣٨

اور اس نے پہلے سے ثابت شدہ حقیقت کو بیان کر دیا۔ (النباء۔٣٨)

---

١١۔ عام فہم بات ہے کہ بیٹے، (حقیقی اور اختیار کردہ؛ adopted) کو ہم اس کے نام سے بتاتے ہیں جس کا وہ بیٹا ہے یا جس سے منسوب کرتے ہیں۔
اس نکتے سے بھی واضح ہے کہ الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) ذاتی نام (proper noun) ہے صفت نہیں۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۗ

جان لو؛ انہوں (قدیم یہودی عمائدین) نے کہا "اللہ تعالیٰ نے عزیر کو زیر مقصد بطور بیٹا اپنا لیا ہے"۔

سُبْحَانَهُ ۖ

وہ جناب ان حاجات سے بلند تر ہیں، تمام کبریائی ان کے لئے، اور تمام کوششوں کا وہ محور ہیں۔

هُوَ الْغَنِيُّ ۖ

وہ جناب ہیں جو ہر احتیاج سے مطلق منزہ اور مطلق آزاد ہیں۔ (حوالہ سورۃ یونسؑ۔٦٨)

---

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ۝٨٨

اور انہوں (اکابرین یہود و نصاریٰ) نے کہا "الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) نے فلاں کو زیر مقصد بیٹا اختیار کیا ہے"۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ۝٨٩

آپ ﷺ انہیں متنبہ کریں الکہف۔٤) "تم لوگوں نے انتہائی نامناسب، حقیقت سوز/باعث خلفشار بات کو منہ سے بیان کیا ہے"

تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ

قریب ہے کہ آسمان اپنے آپ کو ازخود اس قول سے پیدا ہونے والے ارتعاش سے اصل حالت میں کر لیں۔

وَتَنشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝٩٠

اور زمین شگافتہ ہو جائے اور پہاڑ دھڑام سے نیچے گر جائیں۔

أَن دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا ۝٩١

اس خلفشار سے کہ انہوں نے الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) کے حوالے سے بیٹا اپنانے کا اعلان کیا ہے۔

وَمَا يَنبَغِي لِلرَّحْمَٰنِ أَن يَتَّخِذَ وَلَدًا ۝٩٢

باوجود یہ جاننے کہ کسی کو بطور بیٹا اختیار کرنا الرّحمٰن (عزوجل) کے لئے مناسب اور شایان شان نہیں ہے۔

إِن كُلُّ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَٰنِ عَبْدًا ۝٩٣

تمام کے تمام جو آسمانوں اور زمین میں ذی حیات و شعور بستے ہیں ان میں کوئی ایسا نہیں جو الرّحمٰن (عزوجل) کے حضور پیش ہوتا ہے سوائے بندے کی حیثیت میں۔ (سورۃ

قرءانِ مجید میں اس موضوع پر جب بھی ذکر ہوا تو یہ دو نام بیان ہوئے ہیں۔

۱۲۔قرءان مجید میں آیات کو صرف۔ءَايَـٰتُ ٱللَّهِ۔اللہ تعالیٰ کی آیات اور۔ءَايَـٰتُ ٱلرَّحۡمَـٰنِ۔الرّحمن(ذوالجلال والاکرام)کی آیات کہا گیا ہے۔اس سے بھی واضح ہے کہ الرّحمن(ذوالجلال والاکرام)ذاتی نام(proper noun)ہے صفت نہیں۔

تِلۡكَ ءَايَـٰتُ ٱللَّهِ

یہ(بیان کردہ)اللہ تعالیٰ کی آیات،کلام اللہ پر مشتمل قرءان حکیم کے مندرجات ہیں۔

نَتۡلُوهَا عَلَيۡكَ بِٱلۡحَقِّ

ہم جناب آپ(ﷺ)کو حسن ترتیب سے انہیں(آیات)سنا رہے ہیں،یہ موقع محل کی نسبت سے بیان حقیقت ہے۔

وَإِنَّكَ لَمِنَ ٱلۡمُرۡسَلِينَ ٢٥٢

اور یقیناً آپ(ﷺ)بلاشبہ تمام انسانوں کے لئے عالمگیر رسول ہیں ان میں سے منفرد جنہیں مختلف زمان اور اقوام میں بحثیت رسول بھیجا گیا تھا۔(البقرۃ۔۲۵۲)

---

وَكَيۡفَ تَكۡفُرُونَ

مگر تم لوگ کیسے قرءان مجید کو پس پشت ڈال سکتے ہو،اس سے غفلت برت سکتے ہو۔نگاہوں سے اوجھل کر سکتے ہو؟

وَأَنتُمۡ تُتۡلَىٰ عَلَيۡكُمۡ ءَايَـٰتُ ٱللَّهِ

جبکہ تم لوگ اس حال میں ہو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات لفظ بلفظ تم لوگوں کو سنائی جاتی ہیں۔

وَفِيكُمۡ رَسُولُهُۥۗ

اور اس حال میں ہو کہ ان جناب کے رسول(محمد ﷺ)تم لوگوں کے مابین بحثیت نذیر/متنبہ کرنے والے اور معلم موجود ہیں(محذوف خبر کے لئے حوالہ 6:19)۔

وَمَن يَعۡتَصِم بِٱللَّهِ

اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مرجع خلائق کا تعلق استوار کر لیتا ہے

فَقَدۡ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ١٠١

تو یقیناً وہ منزل کی جانب رواں دواں رکھنے والے راستے کی جانب ہدایت دے دیا گیا۔(ءال عمران۔۱۰۱)

---

تِلۡكَ ءَايَـٰتُ ٱللَّهِ

یہ(بیان کردہ)اللہ تعالیٰ کی آیات،کلام اللہ پر مشتمل قرءان حکیم کے مندرجات ہیں۔

نَتۡلُوهَا عَلَيۡكَ بِٱلۡحَقِّۗ

ہم جناب آپ(ﷺ)کو حسن ترتیب سے انہیں(آیات)سنا رہے ہیں،یہ موقع محل کی نسبت سے بیان حقیقت ہے۔

وَمَا ٱللَّهُ يُرِيدُ ظُلۡمٗا لِّلۡعَـٰلَمِينَ ١٠٨

مطلع رہو؛اللہ تعالیٰ تمام تخلیقات سے کسی قسم کی زیادتی کاارادہ نہیں رکھتے۔(ءال عمران۔۱۰۸)

---

تِلۡكَ ءَايَٰتُ ٱللَّهِ

یہ (بیان کردہ)اللہ تعالیٰ کی آیات، کلام اللہ پر مشتمل قرءان حکیم کے مندرجات ہیں۔

نَتۡلُوهَا عَلَيۡكَ بِٱلۡحَقِّ

ہم جناب آپ(ﷺ)کو حسن ترتیب سے انہیں(آیات)زبانی سنارہے ہیں، یہ موقع محل کی نسبت سے بیان حقیقت ہے اس مقصد سے کہ آپ نے من وعن لوگوں کو زبانی اور تحریر میں اشاعت کرنا ہے۔

فَبِأَيِّ حَدِيثِۭ بَعۡدَ ٱللَّهِ وَءَايَٰتِهِۦ يُؤۡمِنُونَ ٦

چونکہ بیان حقیقت میں ان کے لئے ہر موقع محل کے لئے ہدایات موجود ہیں اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حدیث/بیان اور ان کی آیات/مندرجات قرءان مل جانے کے بعد کس حدیث/بیان پر وہ ایمان لانا چاہتے ہیں؟(الجاثیہ۔۶)

---

أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِم مِّنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ

یہ نام لے کر بیان کردہ ہستیاں وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے خلعت کامرانی سے نوازا ہے،بحثیت انبیاء(علیہم السلام)۔

مِن ذُرِّيَّةِ ءَادَمَ وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوحٖ

ان میں سے بعض کا شجرہ نسب ءادم کی ذریت میں تھااور ان میں بعض کا تعلق ان اشخاص کی ذریت سے تھا جنہیں ہم جناب نے نوح علیہ السلام کے ساتھ سوار کیا تھا۔

وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡرَٰٓءِيلَ

اور ان میں بعض کا شجرہ نسب ابراہیم(علیہ السلام)اور بعض کا اسرائیل(علیہ السلام)سے تھا۔

وَمِمَّنۡ هَدَيۡنَا وَٱجۡتَبَيۡنَآۚ

اور ان میں سے بعض کا تعلق ذریت ان سے تھا جنہیں ہم جناب نے ہدایت سے نوازا اور فوقیت دیتے ہوئے انہیں منتخب فرمایا تھا۔

إِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتُ ٱلرَّحۡمَٰنِ خَرُّواْ سُجَّدٗا وَبُكِيّٗا ۩ ٥٨

جب الرّحمن(ذوالجلال والاکرام)کی آیات انہیں سنائی جاتی تھیں تو وہ ان کے حضور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ از خود سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔(مریم۔۵۸)

[آیت سجدہ]

---

۱۳۔ادب، عظمت، رعب، دبدبہ، احترام کا احساس شخصیت کے حوالے سے ہوتا ہے۔

ٱلَّذِينَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُم بِٱلۡغَيۡبِ

(متقین وہ ہیں)جو اپنے رب کے جاہ وجلال کے ہر سو مظاہر سے رعب، دبدبہ، احترام اور اپنے ساتھ موجودگی کا از خود احساس رکھتے ہوئے سہمے سہمے مرعوب رہتے ہیں، بصارتوں سے اوجھل ہونے کے باوجود؛

وَهُم مِّنَ ٱلسَّاعَةِ مُشۡفِقُونَ ٤٩

اور وہ متعین لمحے پر یقین سے محتاط، نرم خو، شفقت اور ہمدردی کا رویہ اپناتے ہیں۔(سورۃ الانبیاء۔۴۹)

---

إِنَّ ٱلَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ۝٥٧

ان لوگوں کے متعلق جان لو؛ وہ جو اپنے رب کے جاہ و جلال کے ہر سو مظاہر فطرت سے سہمے سہمے انداز میں متاثر اور مرعوب ہو کر محتاط، نرم خو، لطافت، شفقت اور ہمدردی کا رویہ اور طرز عمل اپنائے رکھتے ہیں۔(المومنون۔۵۷)

---

وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ

ان کے متعلق حقیقت جان لو جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور ان کے رسول (ﷺ) کے قول (قرءان عظیم) کو صدق دل سے تسلیم کیا۔

وَيَخْشَ ٱللَّهَ وَيَتَّقْهِ

اور اللہ تعالیٰ کے رعب، دبدبہ، احترام اور اپنے ساتھ موجودگی کا احساس رکھا، اپنی بصارتوں سے اوجھل ہونے کے باوجود اور تندہی سے محتاط اور محفوظ رکھتے ہوئے ان سے پناہ کے خواستگار رہے۔

فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَآئِزُونَ ۝٥٢

چونکہ انہوں نے جنت کے حقدار بننے کے تمام تقاضے پورے کئے اس لئے یہ ہیں وہ لوگ جو زندگی بھر کی کامیابی کا ایوارڈ پانے والے ہیں۔(النور۔۵۲)

---

إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ ٱتَّبَعَ ٱلذِّكْرَ

یہ حقیقت زمان و مکان میں برقرار رہے گی کہ آپ (ﷺ) کی تنبیہ کا اثر صرف اس پر ہوتا رہے گا جس نے سرگزشت تاریخ، منبع پند و نصیحت (قرءان مجید) کا اس انداز میں اتباع کیا کہ فکر و نظر میں کسی تیسرے کو حائل نہیں ہونے دیا۔

وَخَشِىَ ٱلرَّحْمَٰنَ بِٱلْغَيْبِ ۖ

اور اس کا حال یہ تھا کہ الرَّحمٰن ذوالجلال کے جاہ و جلال کے ہر سو مظاہر سے رعب، دبدبہ، احترام اور اپنے ساتھ موجودگی کا از خود احساس رکھتے ہوئے ان کے بصارتوں سے اوجھل ہونے کے باوجود سہما سہما مرعوب رہتا تھا۔

فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ ۝١١

چونکہ اس نے جنت کا مستحق ہونا ثابت کر دیا ہے اس لئے۔ آپ (ﷺ) ایسے شخص کو خوشخبری اور ضمانت دے دیں کہ اس کے ماضی کی پردہ پوشی کرتے ہوئے معافی اور اعلیٰ ترین ایوارد کا وعدہ ہے۔(یٰس۔۱۱)

---

مَّنْ خَشِىَ ٱلرَّحْمَٰنَ بِٱلْغَيْبِ

جس نے الرّحمن (ذوالجلال والاکرام) کے رعب، دبدبہ، احترام اور اپنے ساتھ موجودگی کا احساس رکھا، اپنی بصارتوں سے اوجھل ہونے کے باوجود،

وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ ۝٣٣

اور وہ وقف کئے ہوئے قلب کے ساتھ آیا۔(سورۃ قٓ۔۳۳)

---

فعل۔خَشِيَ۔کا مادہ "خ ش ی" ہے۔یہ مادہ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ادب، عظمت، رعب، دبدبہ، احترام کا احساس اور دوسرے معنی دہشت، ہیبت ہیں۔پہلے

معنی کے لئے انگریزی کا لفظ "Awe" اس مادہ میں سمائے تصور کے زیادہ قریب ہے۔ یہ جذبہ آمیزہ ہے، تعجب اور خوف، حیرانگی اور ادب واحترام کا جس میں خوف اور اپنی نسبتاً گم مائیگی، کم وقعتی اور کمزوری کا احساس بھی شامل ہو۔ لوگوں کے لئے بصارت اس احساس کو اجاگر کرنے کا ذریعہ ہے، کائنات کے ذرے ذرے کا مشاہدہ اس کے خالق کی موجودگی کے تصور کو ابھارتا ہے۔ یہ ایک مثبت احساس ہے کہ ہم ایک عظیم الشان اور لامتناہی ماحول میں ہیں جو ہمارے محدود تصور دنیا سے بالاتر ہے۔ Awe، تعجب اور خوف، حیرانگی اور ادب واحترام کے احساس کا تجربہ ان لوگوں کو ہوتا ہے جو سنجیدگی سے اپنے ماحول اور دنیا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ انہیں اپنے کمتر (small-self) ہونے کا احساس دلاتا ہے، کائنات کے مقابل نہیں، بلکہ اپنے رب، قادر مطلق الرّحمن (ذوالجلال والاکرام) کے حوالے سے۔ اور یہ ان کی اپنی شخصیت کے لئے باعث اوج بنتا ہے۔

اسم علم "الرّحمٰن" ذوالجلال والاکرام ہمارے جسم کے کھربوں خلیوں میں بھی کندہ ہے۔ ان جناب کو دنیا میں معبود مطلق تسلیم نہ کرنے والے بھی تمام زمان ومکان میں آشنا رہے ہیں۔ لبوں پر وہی نام آتا ہے جو یاداشت میں کندہ ہو۔ یوم قیامت از سر نو حیات پانے پر ہماری مرتے وقت تک کی یاداشت بھی بحال ہو جائے گی۔ حیات بحال ہونے پر لوگوں کے لبوں پر جو عظیم المرتبت نام ہو گا آئیں اسے سنیں:

## وَنُفِخَ فِى ٱلصُّورِ

(سب مر گئے اور سکوت چھا گیا) اور اس دن حب خاص طور پر بنائے گئے نقارے میں دوسری مرتبہ پھونک دیا جائے گا۔

## فَإِذَا هُم مِّنَ ٱلْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ ﴿٥١﴾

تو اس وقت اچانک اپنی قبروں/مدفون مقامات سے امنڈ کر اپنے رب کی جانب وہ مانند لہر (گروہ در گروہ۔ النباء۔ 18) رواں ہوں گے۔

## قَالُوا۟ يَٰوَيْلَنَا مَنۢ بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۜ

انہوں نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا "ہائے ہماری شومئی قسمت! کس نے ہمیں زندہ کر کے جگا کر ہماری قبروں/نیند گاہوں میں سے کھڑا کر دیا۔

## هَٰذَا مَا وَعَدَ ٱلرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ ٱلْمُرْسَلُونَ ﴿٥٢﴾

یہ وہ ہے جس کا الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) نے وعدہ کیا تھا۔ اور مبعوث فرمائے گئے رسولوں نے اس کی سچائی کی تصدیق کی تھی"۔ (یٰسٓ۔ ۵۲)

ہم نے دیکھا کہ قرءان مجید نے پوچھے گئے سوال کا جواب انتہائی وضاحت اور ہر زاویئے سے ہمیں عنایت کر دیا ہے کہ الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) ہمارے رب، اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام (Proper noun) ہے، صفت (adjective) نہیں۔ یہ مترجمین کی سہو تھی کہ انہوں نے ایک نام نہاد عیسائی سکالر کے صریحاً غلط ترجمے کو اپنایا اور زبان زد عام کر دیا۔

مجھے قدیم "مفسرین" کے فہم وفراست، علم وادراک اور لسانیات کی بنیاد اور باریکیوں سے آشنا ہونے متعلق کوئی تذبذب نہیں۔ مگر میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایسے اسم علم کے متعلق جو ستاون بار استعمال فرمایا گیا ہے انہوں نے کیوں اور کن کے زیر اثر لوگوں کے لئے الجھاؤ، ابہام اور اشکال پیدا کئے۔ کیا یہ گمان بھی کیا جا سکتا ہے کہ انہیں اسم علم اور اسم صفت اور اسم مبالغہ کے مابین بنیادی فرق کا بھی ادراک نہیں تھا؟ ممکن نہیں۔ اسم علم اور صفت میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اسم علم فقط ہستی کا تعارف (cognition) ہے جو اس کے موجود ہونے یا وجود پر دلالت کرتا ہے۔ اور صفت ہمیشہ ایک تعلق، رشتے، معاشرتی رویئے کا اظہار کرتی ہے جو لازماً دو کے مابین پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس میں مثبت اور منفی کا پہلو ہوتا ہے اور یہ کہ کم یا زیادہ درجے میں وہ بیک وقت زیادہ شخصیات میں پائی جا سکتی ہے۔ اس کے بالمقابل اسم علم حوالے کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ ہستی کا محض تعارف ہے اور یکتا ہے۔

---

## ہستی کی پہچان؛ رویہ اور روش ٱلرَّحِيمِ

## بِسْمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

جملے کا آخری لفظ بھی اسم معرفہ ہے اور مجرور ہے جس سے اس کا پچھلے لفظ سے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔

## ٱلرَّحۡمَـٰنِ ٱلرَّحِيمِ

مرکب توصیفی۔ موصوف۔ صفت۔

ہستی کا تعارف نام سے ہوتا ہے اور یہ نام/اسمِ خاص اُس ہستی کی انفرادیت/individuality اور باقی تمام موجودات سے منفرد، ممتاز، متمیز[Unique] ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ ہستی کا ذاتی نام اُس کے ظاہر یعنی موجود ہونے کی حقیقت کا اظہار کرتا ہے چاہے وہ ہستی بصارتوں کی پہنچ سے باہر ہو۔ ہر ہستی ایک واحد اکائی ہے جس کا ظاہر یعنی اُس کی موجودگی ہے اور اُس کا باطن ہے۔ ہستی کا ظاہر، اُس کا اسمِ ذات دوسروں کیلئے تعارف ہے اور باطن، پنہاں حقیقت اور اُس ہستی کی پہچان ہے۔ اور اِس پنہاں حقیقت کی پہچان اور ادراک اُس ہستی کی صفات، قدرتوں اور افعال کو جاننے اور پہچاننے سے ہوگا وگرنہ علم وادراک محض اُس ہستی کے تعارف تک محدود رہے گا۔
دنیا کی تمام زبانوں سے عربی مبین منفرد اور ممتاز و برتر زبان ہے۔ یہ حقیقت کو بیان کرنے والی زبان ہے۔ یہ تخلیق کردہ تمام موجودات میں عظیم ہستی، ہمارے رہنما، ہمارے معلم، آقائے نامدار، رسولِ کریم ﷺ کی زبان ہے جس کا ہر ایک انداز اور قاعدہ صادق اور امین ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ ہستی اول ہے، ہستی کی موجودگی کی معرفت اول ہے اور اُس کی صفات کا ادراک ثانوی مقام پر ہے۔ اردو اور انگریزی زبان کے برعکس عربی میں موصوف کو پہلے بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اول سچائی/حقیقت اُس کی موجودگی ہے اور صفت بعد میں بیان ہوتی ہے جو اُس ذات کا جزو لاینفک بھی ہو سکتا ہے اور اختیار کردہ بھی۔

قرءانِ مجید کے اول مرکب توصیفی کے دو اسماء کو اگر ہم معمولی دھیان سے بھی دیکھیں تو ہمیں ایسی چار نشانیاں ابھر کر دکھائی دیں گی جو دونوں میں یکساں ہیں اور کچھ دیر تک اِن کو بار بار دیکھنے اور دہرا لینے اور چند دوسرے مرکبات توصیفی کو تلاش کر لینے کے بعد آئندہ قرءانِ مجید کی تحریر میں ایسے مرکبات کی نشاندہی ہمارا ذہن خود بخود میکانکی انداز میں ہمیں کرا تا رہے گا۔

(۱) جنس: موصوف۔ ٱلرَّحۡمَـٰنِ۔ اور صفت۔ ٱلرَّحِيمِ۔ دونوں مذکر ہیں۔ اسم موصوف اور اسم صفت میں ہمیشہ مطابقت ہوتی ہے۔ اگر موصوف مؤنث ہے تو صفت بیان کرتا ہوا لفظ/اسم صفت بھی مؤنث ہوگا۔

(۲) عدد: موصوف اور صفت تعداد کے حوالے سے یکساں ہیں۔ موصوف واحد ہے تو اسم صفت بھی واحد ہوگا اور اگر موصوف کا عدد تثنیہ/دو ہے تو صفت بیان کرتا ہوا اسم اُس کے مطابق ہوگا اور اگر موصوف جمع ہے تو صفت کا اسم بھی جمع ہوگا۔

(۳) وسعت: موصوف اور صفت دونوں معرفہ ہیں۔ وسعت کے اعتبار سے اس مرکب کے دونوں اسماء یکساں ہوں گے۔ اگر اسم موصوف نکرہ ہے تو اسم صفت بھی نکرہ ہوگا۔

(۴) اعراب: اعراب کے اعتبار سے بھی دونوں اسماء میں مطابقت ہے کہ دونوں مجرور ہیں۔ اعراب کے اعتبار سے اس مرکب کے دونوں اسماء یکساں ہوں گے۔ اگر موصوف حالت رفع [آخری حرف پر پیش]، حالت نصب [آخری حرف پر زبر] یا حالت جر [آخری حرف پر زیر] میں ہے تو اسم صفت اُس کے مطابق حالت میں ہوگا۔
(کائنات کے اِس عظیم ترین مرکب توصیفی کو انہماک اور محبت سے دیکھنے پر گرائمر کے علاوہ آپ کے قلب وبصر کو کچھ اور بھی سجھائی دینے لگے تو ازراہ کرم مجھے اور میری بیوی کو دعاؤں میں یاد رکھیں)

اللہ تعالیٰ اور آقائے نامدار ﷺ نے قرءانِ عظیم میں انتہائی واضح انداز میں بتایا ہے کہ الرحمٰن ہمارے رب کا ذاتی نام ہے۔
ہستی کو ہم اُس کے نام سے پکارتے ہیں۔ لیکن ہستی کی پہچان اُس کی صفات، رویے اور روش اور منصب کے حوالے سے ہوتی ہے۔ اس لئے ہستی کو براہ راست (one-to-one, personally) پکارنا ہو تو اُس کی صفات کے حوالے سے جو نام بنتا ہے اُس سے بھی پکارا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسروں کے سامنے اُس ہستی کو نام سے متعارف کرانے کے بعد اُس کی صفات (attributes) کو بیان کر کے دوسروں کو اُس کی پہچان کراتے ہیں۔ صفات میں مثبت اور منفی کا تعین کیا جاتا ہے۔ ہر مثبت صفت ''حسن'' کی حامل ہے؛ اِس لئے مثبت صفات بیان کرنے والے اسماء ''اسماء الحسنیٰ'' کہلاتے ہیں۔

وَلِلَّهِ ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ فَٱدۡعُوهُ بِهَا ۖ

یادرکھو کہ بدرجہ اتم مثبت توازن وحسن کی خصوصیات/صفات کا اظہار کرنے والے نام/اسماء صرف اللہ تعالیٰ کیلئے شایان شان ہیں۔ لہٰذا تم لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اِن بدرجہ اتم صفات کے حامل ناموں کے ساتھ پکارو۔

وَذَرُواْ ٱلَّذِينَ يُلۡحِدُونَ فِيٓ أَسۡمَٰٓئِهِۦ ۚ

اوران لوگوں کو اپنے حال میں مگن چھوڑ دو جوان جناب کے ناموں کے بارے میں گستاخی اور کج روی کرتے ہیں۔

سَيُجۡزَوۡنَ مَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ١٨٠

عنقریب انہیں اس کی جزا مل جائے گی جو وہ کرتے رہے ہیں۔(الاعراف۔۱۸۰)

---

قُلِ ٱدۡعُواْ ٱللَّهَ أَوِ ٱدۡعُواْ ٱلرَّحۡمَٰنَ ۖ

آپ(ﷺ)ارشاد فرمائیں ''تم لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا تم لوگ الرّحمٰن کہہ کر پکارو۔

أَيّٗا مَّا تَدۡعُواْ فَلَهُ ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ ۚ

جس لمحے بھی تم لوگ طلبگار توجہ ہو تو تمہیں بدرجہ اتم تعریف کے حامل اسماء کے ساتھ ان جناب کو پکارنا چاہیئے کیونکہ بدرجہ اتم خصوصیات، توازن وحسن، کبریائی کو بیان کرتے اسماء صرف اور صرف ان (الرحمٰن ذالجلال والاکرام) کے لئے مختص اور شایان شان ہیں۔''

وَلَا تَجۡهَرۡ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتۡ بِهَا وَٱبۡتَغِ بَيۡنَ ذَٰلِكَ سَبِيلٗا ١١٠

اور آپ(ﷺ)اپنی صلوٰۃ کی ادائیگی کے دوران آواز بلند کریں اور نہ اتنا کم کریں کہ بے صوت/ساکت لگے، اور احتیاط سے ان دو حدوں کے درمیان میں رہیں۔(الاسراء۔۱۱۰)

**ٱلرَّحِيمِ**:اسم المبالغة۔ یہ بروزن ''فَعِیلٌ''مصدر ''رَحۡمَةٌ'' سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اسم مبالغہ اور اسم تفضیل میں فرق یہ ہے کہ اس میں معنی دوسروں کو دھیان /تقابل میں رکھے بغیر اپنے آپ تک محدود رہتے ہیں جبکہ اسم تفضیل میں اضافی معنی دوسروں کے مقابلے میں ہیں۔ جب یہ بطور اسم فاعل کے استعمال ہوں تو ان کی جنس متذکرہ ہستی کے مطابق ہوگی۔ یہ معرفہ باللام ہے جو استغراق جنس کے معنوں میں ہے، یعنی منسلک اسم میں پنہاں معنی کی تمام تر وسعتوں اور اس کے تمام زمان ومکان پر محیط ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے ترجمہ **''منبع رحمت''** کیا ہے۔ **اُن کے تمام فیصلے رحمت کی چھاؤں میں ہوتے ہیں۔**
قرءانِ مجید میں مجرور حالت میں یہ لفظ چھ بار اور مرفوع حالت۔ **ٱلرَّحِيمُ**۔ اٹھائیس بار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کیلئے استعمال ہوا ہے۔ آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کی صفت کے طور پر نکرہ حالت میں استعمال فرمایا گیا ہے۔

اِس کا مادہ ''ر۔ح۔م'' ہے۔ جناب ابن فارس نے بتایا کہ اِس میں سمو یا بنیادی تصور یہ ہے، ''يدلُّ على الرِّقّة والعطف والرأفة''۔ یہ ہمیں طاقت کے استعمال میں نرمی، ہمدردی، شفقت، احسان، اور التفات اور محبت کے تصور سے آشنا کرتا ہے۔

قرءانِ مجید کے مطالعہ کی ابتداء کرتے ہوئے ہم نے کائنات کی اول حقیقت کو بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ کے اسم ذات الرحمٰن سے ابتداء ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الرّحمٰن ذالجلال والاکرام کے ارادہ اور منشاء کے بغیر کائنات میں موجود مادہ تو کیا، ارادہ واختیار کے مالک بھی، کسی شئے اور معاملے کی ابتداء نہیں کر سکتے حتیٰ کہ ایمان لانے کا اقرار اور اعلان کرنا بھی جبھی ممکن ہے جب اُن کی رضا/اذن شامل ہو [یہ سائنسی/Physical fact حقیقت ہے جس کے متعلق انشاءاللہ ہم مطالعہ کریں گے]۔ اور سب سے پہلے اُن کی

صفت لا ینفک/صفاتی نام۔ ٱلرَّحِيمِ۔ کو ہم نے بیان کیا۔ ہم جب لفظ رحم اور رحیم استعمال کرتے ہیں تو ہمارے فہم میں وہ جس پر رحم اور رحمت کا برتاؤ اور نزول کیا جائے موجود ہوتا ہے۔ یہ لفظ دو کے مابین رشتے اور رویئے کا اظہار کرتا ہے۔

الرّحمٰن ذالجلال والاکرام نے ہمارا رب بننے کیلئے کائنات کی تخلیق کی ابتدا کس سے کی تھی؟ کائنات میں اہم اور عیاں ترین حقیقت کیا ہے؟ طاقت، قوت، غلبہ، حاکمیت:

أَنَّ ٱلْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا

کہ حقیقی طاقت کا ارتکاز اور استعمال کا استحقاق اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، مکمل طور پر۔ (حوالہ البقرۃ۔۱۶۵)

اِس لئے حاکمیت اعلیٰ اور مکمل غلبہ اُن کا ہے:

إِنَّ ٱلْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ج

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے تمام غلبہ واقتدار مکمل طور پر مخصوص ہے۔ (حوالہ النساء۔۱۳۹؛ یونس۔۶۵)

---

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ ٱلْقَوِيُّ ٱلْعَزِيزُ ٦٦

یہ حقیقت ہے آپ (ﷺ) کے رب وہ ہیں جو تمام قوت کے مالک اور مکمل طور پر غالب ہیں۔ (حوالہ سورۃ ھودؑ۔۶۶)

الاسماء الحسنیٰ میں دو نام القوی اور العزیز ہیں۔ قوت وطاقت میں ہر شئے کو تحس نحس کرنے کی صلاحیت ہے۔ طاقت میں تخریب کا عنصر بھی پنہاں ہے۔ کیا طاقت اور قوت میں حسن ہوتا ہے اور یہ حسین کہلا سکتی ہے؟ کیا طاقت میں حُسن پیدا کیا جا سکتا ہے؟ طاقت، قوت اور غلبہ ایک ایسی شئے ہے جس پر خارج سے پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ طاقت (infinite, absolute power) کے مالک اللہ رب العزت نے بتایا کہ اُن کی یہ طاقت حُسن کی حامل ہے۔ طاقت میں حسن کیسے پیدا ہوتا ہے؟ الرّحمٰن ذالجلال والاکرام نے ارشاد فرمایا:

كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ ٱلرَّحْمَةَ ۚ

انہوں نے رحم وکرم کا شیوہ اپنے آپ پر لازم کر لیا تھا۔ (حوالہ الانعام۔۱۲)

---

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ ٱلرَّحْمَةَ ۖ

تم لوگوں کے رب نے رحم وکرم کا شیوہ اپنے آپ پر لازم کر لیا تھا۔ (حوالہ الانعام۔۵۴)

---

وَرَبُّكَ ٱلْغَنِيُّ ذُو ٱلرَّحْمَةِ ج

اور آپ (ﷺ) کے رب کامل غنی اور صاحب رحمت ہیں۔ (حوالہ الانعام۔۱۳۳)

---

فَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَٰسِعَةٍ

آپ (ﷺ) کے بتادینے پر اگر وہ آپ کی بات کو برسر عام جھٹلا دیں تو آپ (ﷺ) فرمادیں "تم لوگوں کے رب صاحب رحمت ہیں جو وسیع تر ہے" (حوالہ انعام۔۱۴۷)

---

وَرَحۡمَتِي وَسِعَتۡ كُلَّ شَيۡءٖۚ

اور میری رحمت تمام چیزوں پر پھیلی ہوئی ہے۔(حوالہ الاعراف۔۱۵۶)

---

وَرَبُّكَ ٱلۡغَفُورُ ذُو ٱلرَّحۡمَةِۖ

مگر آپ(ﷺ) کے رب حد درجہ بخشنے والے اور صاحب رحمت ہیں۔(حوالہ الکہف۔۵۸)

تمام قوت اور تمام غلبے کے مالک الرّحمٰن ذالجلال والاکرام نے عالمین کی تخلیق کی ابتدا فرمائی تو طاقت و قوت و غلبہ پر رحمت، رحم و کرم کے شیوہ کو اپنے آپ پر لازم کر لیا۔ تمام تر قوت کے مالک نے اپنے آپ کو الرحیم بنا کر تخلیق کی ابتدا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کے اسم ذات الرّحمٰن سے ابتدا ہے جو الرحیم ہیں کہ رحم و کرم کے شیوہ کو اپنے آپ پر واجب کر کے عالمین کی ابتدا کی۔ اور اِس تخلیق کردہ کائنات کو سمیٹ دینے سے قبل جن وانس کو پیغام اور ہدایت بھیجنے کا جب اختتام فرمایا تو، سبحان اللہ، رحمت کو مجسم بھی فرما دیا:

وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا رَحۡمَةٗ لِّلۡعَٰلَمِينَ ١٠٧

اور ہم جناب نے آپ(محمد ﷺ) کو محض بحیثیت رسول نہیں بھیجا مگر آپ کو دنیا میں بھیجے جانا تمام موجودات کیلئے مجسم اظہار رحمت ہے۔(الانبیاء۔۱۰۷)

### آقائے نامدار، محمد ﷺ کی تخلیقات میں منفرد شان رَحۡمَةٗ لِّلۡعَٰلَمِينَ

الرحمٰن ذالجلال والاکرام کا منبع رحمت ہونا انسان کیلئے اظہار محبت ہے۔ کس انسان کیلئے؟ وہ معلوم ہو جائے تو تخلیق کائنات کا اول سبب عیاں ہو جائے گا۔ ارشاد فرمایا:

قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ

آپ(ﷺ مدعیان ایمان کو) واضح فرمادیں "اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے لگن اور تعلق خاطر چاہتے رہے ہو۔

فَٱتَّبِعُونِي

تو اس کے حصول کے لئے تم لوگ صدق دل سے اس انداز میں میری پیروی کرو کہ میرے اور تمہارے درمیان تیسرا حائل نہ ہو۔

يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ

ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ تم سے لگن اور تعلق خاطر فرمائیں گے۔

وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡۗ

اور وہ جناب تمہارا یہ طرز عمل اختیار کرنے پر تم لوگوں کی خاطر تمہارے ان حرائم/مجرمانہ الزام تراشیوں سے جو تم کر چکے ہو پردہ پوشی فرماتے ہوئے معاف فرمادیں گے۔

وَٱللَّهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ٣١

اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یقین رکھو کہ درگزر اور پردہ پوشی کرنے اور اکثر و بیشتر معاف فرمانے والے ہیں، منبع رحمت ہیں"۔(ءال عمران۔۳۱)

جسے محبت نہیں وہ کیا جانے رحم، رحمت کے معنی اور مفہوم کیا ہیں۔ فلسفہ عشق شاعروں کی خیالی پرواز ہے۔ عشق کا دعویٰ نہیں ہوا کرتا کہ دعویٰ عشق ہی کو مشکوک بنا دے گا۔ خامشی میں پنہاں ہے لطف و لذت عشق۔ عشق کا دعویٰ تو وہ بھی نہیں کرتا جو اپنے آپ کو الصمد کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ عشق کو بھی طشت از بام کبھی کرتا ہے کوئی! محبت کی اوج الرّحمٰن ذالجلال والاکرام کا الرحیم ہونا ہے۔

محبت اپنا اظہار کرتی ہے اور محبت مطمئن بھی تبھی ہوتی ہے جب جواب میں محبت ملے۔ عشق وہ کیفیت ہے جس میں لین دین کا سوال نہیں ہوتا لیکن محبت کا اصول یہی ہے۔ا للہ تعالیٰ نے اپنے سے محبت کرنے کا شوق اور دعویٰ کرنے والوں کو عالمین کے صادق اور امین آقائے نامدار، رسولِ کریم ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوا بھیجا کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی محبت کے جواب میں اگر تم محبت پانا چاہتے ہو تو اُسے پانے کا پھر ایک ہی طریقہ ہے کہ رسولِ کریم ﷺ کی اتباع کرو ہم تم سے محبت کریں گے اور تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔ ویسے بھی چاہے جانیوالوں کی کمزوریوں پر محبت کرنے والوں کی نگاہ نہیں پڑا کرتی۔
یارب! اصل محبت چھپتی نہیں چاہے تیری ہو یا میری۔ تسبیح کے دانے رولنے سے اطمینان قلب تو لازماً ملتا ہے لیکن محبت تو جبھی ملتی ہے جب کوئی رنگ لے اپنے آپ کو اُس کے رنگ میں جس کی محبت پانے کی چاہت ہے۔

محبت کی اوج کیا ہے؟ تمام حمد اللہ تعالیٰ، الرّحمن ذالجلال والاکرام کیلئے ہے جنہوں نے حمد کو بیان کرنے اور ہمیشہ کیلئے اُن کیلئے مختص قرار دینے والے 'احمد' کو کائنات میں محمد ﷺ کہہ کر ایسی ہستی کے طور پر متعارف کرایا جو مسلسل تعریف کے شایان ہیں۔ اسم محمد ﷺ (جو باب تفعیل سے اسم مفعول ہے) کے یہی معنی ہیں۔ لائق سجدہ ہے صرف اللہ تعالیٰ، الرحمن ذالجلال والاکرام کی ذات جنہوں نے انسانوں کو اپنی محبت پانے کا یہ راز بتایا کہ اُن کی اتباع کرو جن کی تعریف کا تسلسل اللہ تعالیٰ منقطع ہونے نہیں دیتے:

إِنَّ ٱللَّهَ وَمَلَٰٓئِكَتَهُۥ يُصَلُّونَ عَلَى ٱلنَّبِيِّۚ

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُن کے فرشتے مختص اور بلندیوں پر فائز فرمائے (منفرد نبی محمد ﷺ) پر تسلسل سے تعریف اور محبت سے متوجہ اور چھائے رہتے ہیں۔

اور ایمان کے مدعیان کو حکم صادر فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ

اے وہ لوگوں جنہوں نے ایمان لانے کا اقرار و اعلان کیا ہے توجہ سے سنو!

صَلُّواْ عَلَيْهِ وَسَلِّمُواْ تَسْلِيمًا ٥٦

تم لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ تم بھی اُن کی جانب تعریف اور محبت کے جذبات سے لبریز، متوجہ رہو اور انتہائی ادب و احترام کے انداز میں انہیں سلام کہتے رہو۔ (الاحزاب۔۵۶)

آقائے نامدار، رحمت للعالمین رسولِ کریم ﷺ پر سلام اور ان کی عظمت و برتری اور عظیم تخلیق ہونے کا ہمیں احساس اور اعتراف ہے ہر لحہ صبح و شام۔ یارب! چڑھا دے ہم پر بھی یہی رنگ کہ تیری محبت پا سکیں اور سرخرو ہو سکیں۔
عقل فرق کو متعین کرتی ہے۔ زمین پر کسی عشق کا دعویٰ کرنے والے کو کیا کوئی سچا مان سکتا ہے؟ عشق کا دعویٰ تکبر ہے انسان کا خود اپنی ذات کے متعلق غلط گمان ہے۔
آقائے نامدار ﷺ پر درود و سلام ہے ہر لحہ صبح و شام۔ الحمدللہ

جس کسی کا دل مانتا ہے ان کی عظمت و برتری کو تسلیم کر کے ان کے ادب و احترام سے اپنے قلب کو منور کر لے۔ اور جو ابلیس کے شروع کئے "بشر بشر" کی تکرار میں الجھے ہیں تو وہ بھی جان لیں کہ آپ (ﷺ) کو ان سے بھی کدورت اور گلہ نہیں:

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّۚ

مطلع رہو؛ کدورت، بداندیشی، تعصب، کینہ کے جذبات رکھنا ایک ایسے نبی کے لئے زندگی کے کسی لمحے کسی کے لئے رکھنا ممکن نہیں تھا جو مجسم رحمت ہیں۔ (حوالہ۔ءال

جملے میں فعل ناقص کی خبر محذوف ہےاوراس کو متعین کرنے کے لئے مرکب جاری/Prepositional Phrase۔لِنَبِيٍّ۔اس مرکب کا ترجمہ "کسی نبی کی نسبت" صحیح نہیں کیونکہ اس میں حرف جر کا اسم مطلق نکرہ واحد ہےاور فقط ایک نبی کی شخصیت کا حوالہ ہے جن کی صفت/specification بھی محذوف ہے۔ آقائے نامدار، رسول کریم محمد ﷺ واحد نبی ہیں جن کے متعلق تمام نبیوں کی طرح بشیر اور نذیر ہونے کے علاوہ یہ خبر بھی دی گئی ہے:

وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا رَحۡمَةٗ لِّلۡعَٰلَمِينَ ١٠٧

اور ہم جناب نے آپ (محمد ﷺ) کو محض بحیثیت رسول نہیں بھیجا مگر آپ کو دنیا میں بھیجے جانا تمام موجودات کیلئے مجسم اظہار رحمت ہے۔(الانبیاء۔۱۰۷)

اللہ تعالیٰ نے آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کی تمام سابقہ اور موجودہ زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کے قلب مبارک میں کسی بھی ذی حیات کے لئے تعصب، کینہ، رنجش، بدخوئی، کدورت کے جذبات نہیں ہیں۔ان کے قلب مبارک میں تو لوگوں کے لئے ایسا غم جاگزیں ہے جو بار بار کی تشفیوں سے بھی ختم نہیں ہوا۔ان کے قلب مبارک کا غم کیسے ختم ہو جب الرَحمٰن ذوالجلال والاکرام کا یہ اٹل فیصلہ اور اعلان ہو کہ ان ﷺ کی بات کو تسلیم نہ کرنے والا جہنم جائے گا۔یہ شان صرف ان کی ہو سکتی ہے جو۔رَحۡمَةٗ لِّلۡعَٰلَمِينَ ہیں۔

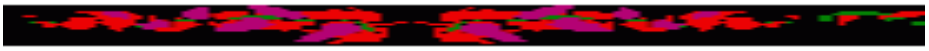

قرءانِ مجید تفسیر حقیقت اور بیان حقیقت ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سورۃ۔۱۔۔۔۔ سُورَةُ الفَاتِحَةِ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مؤلف:مظہر انوار نورانی

---

ترجمہ آیت۔۲ .تا.۴

ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ٢

اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرمادیا ہے[احمد ﷺ نے]۔
وہ موجود و معلوم تخلیق کردہ دنیاؤں/ہر ایک وجود پذیر کے رب ہیں۔(۲)

اردو:آیت مبارکہ کے الفاظ کی صرف و نحو و معنوی تحلیل (ویڈیو)۔۔(قرءان مجید میں اسم/Noun کو پہچاننے کا آسان طریقہ۔ویڈیو)---

ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ٣

ہر وجود پذیر کے رب الرّحمن عزوجل ہیں جو منبع رحمت ہیں۔(۳)

مَٰلِكِ يَوۡمِ ٱلدِّينِ ٤

وہ (الرّحمن عزوجل ) جزاو سزا دیئے جانے کے دن کے مقتدر و منصف ہیں۔(۴)

---

تحلیل۔تشریح معنوی و مفہوم، بلاغت

ان تین آیات میں نو(۹)الفاظ پر مشتمل، ترکیب(structure) کے لحاظ سے ایک سادہ جملہ(simple sentence) ہے۔سادہ جملے میں ایک موضوع (subject/topic)اور ایک خبر(predicate)ہوتی ہے ۔ مرکبات کے اضافے سے جملے کی نوعیت نہیں بدلتی۔الفاظ اور مرکبات کے معنی،اس سادہ جملے کو

معنوی لحاظ سے بیانیہ/معلوماتی (declarative) ظاہر کرتے ہیں۔ ایسے جملے کا مقصد مخاطب اور قاری کو معلومات دینا ہوتا ہے، بحث مباحثہ اور نکتے کو منوانا مقصد نہیں ہوتا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ: یہ ایک اسم اور ایک مرکب (جار و مجرور۔ prepositional phrase) پر مشتمل جملہ اسمیہ ہے۔ عربی زبان میں جملے کی تقسیم اُس کی ابتدا کے لحاظ سے بھی ہے، اگر ابتدا میں اسم ہے تو جملہ اسمیہ (nominal sentence) اور اگر ابتدا میں فعل ہے تو جملہ فعلیہ (verbal sentence) کہلاتا ہے۔ قرءانِ مجید میں یہ جملہ تیئس [23] بار موجود ہے۔

اَلْحَمْدُ ۔ اسم، معرفہ باللام، واحد، مذکر، مرفوع بالضمۃ یعنی آخر میں پیش۔ یہ مبتداء ہے یعنی جس موضوع پر گفتگو کی جانے لگی ہے، جس کے متعلق کوئی خبر [predication] بتائی جانی ہے۔ **جو اسم جملے میں مبتدا کا کردار ادا کرتا ہے ہمیشہ مرفوع ہوتا ہے۔** یہ معرفہ باللام ہے جو استغراق جنس کے معنوں میں ہے، یعنی منسلک اسم میں پنہاں معنی کی تمام تر وسعتوں اور اس کے تمام زمان و مکان پر محیط ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

۔لِلّٰہِ۔ یہ مرکب جار و مجرور ہے۔ ''لِ'' حرف جر ہے۔ استحقاق اور اختصاص کا اظہار کرتا ہے یعنی کسی شئے اور بات کا اخلاص اور تکمیل سے کسی سے مخصوص اور منسوب ہونا۔ اور لفظ الجلالۃ اللہ کے آخر میں حرف جر کی وجہ سے زیر ہے یعنی اسم مجرور ہے، اور اللہ تعالیٰ کے اسم پر اعراب کی حالت کیلئے ہم کہتے ہیں للتعظیم : تعظیم کیلئے۔
یہ جار و مجرور، جسے ماہرین گرائمر ''جملہ نما'' بھی کہتے ہیں یعنی بظاہر جملہ لگتا ہے مگر در حقیقت جملہ/sentence نہیں، جملہ اسمیہ کی خبر کے متعلق ہے جو محذوف ہے کیونکہ حرف جر سے واضح اور متعین ہے۔ اور اگر جملہ اسمیہ میں خبر، بجائے واحد لفظ کے، مرکب یا جملہ ہے تو گرائمر کے ماہرین کہتے ہیں ''فی محل رفع'' یعنی وہ حالت رفع میں ہے کیونکہ **خبر، مبتداء کی مانند، جب ایک لفظ پر مشتمل ہو تو وہ مرفوع ہوتا ہے۔**

اَلْحَمْدُ کا مادہ ''ح م د'' ہے۔ اِس میں سمو یا بنیادی تصور ایک ہستی [شئے، مادہ نہیں] کی عظمت و برتری، قدرت، قوت و غلبہ، باکمال خصوصیات کا بے ساختہ ادراک واحساس ہے، ایسا دل پسند احساس کہ اُس کا اعتراف زبان سے بے ساختہ ادا ہو جائے۔ یہ کسی شئے کا نام نہیں بلکہ ایک احساس اور اعتراف کا اظہار ہے۔
**یہ قلب و ذہن میں خود اپنی چاہت سے ابھرنے والے اُس احساس کے اظہار کا نام ہے جس کا سبب جبر اور مجبوری نہیں۔** یہ کسی کی بزرگ و برتری، اعلیٰ و ارفع مقام و حیثیت کا ادراک اور اپنے کم تر ہونے کے اعتراف کا اظہار ہے۔ یہ صرف احساس اور اُس احساس کو بیان کرنے کے متعلق ہے۔ **اِس لئے اَلْحَمْدُ۔ کے وجود پذیر ہونے کیلئے دو ہستیوں کا موجود ہونا بنیادی اور لازمی امر ہے۔** عظمت و برتری، قدرت، قوت و غلبہ، خالق، باکمال خصوصیات کی حامل اول ہستی، اور دوسری تخلیق کردہ وہ ہستی جو اپنے آپ سے موجود اول ہستی کے متعلق اپنے احساس کو بیان کرے۔

اَلْحَمْدُ۔ کے اول مرتبہ ظہور کیلئے لازم ہے کہ ایک دوسری ہستی موجود ہو جن کی حیثیت و کردار۔ أَحْمَدُ۔ ہو [اسم مفعول، اسم ذات] یعنی ایک ایسی ہستی جو حمد بیان کرے۔ یہ عام فہم بات ہے کہ۔ أَحْمَدُ۔ کا احساس اور اُن کا اُس احساس کو انتہائی عقیدت و احترام اور محبت و اخلاص سے بیان کرنا۔ اَلْحَمْدُ۔ کو حقیقت کا روپ اور ظہور دینا ہے کیونکہ ہمارا ادراک اور سوچا سمجھا فیصلہ ہے کہ کسی ہستی کا خود اپنی تعریف کرنا ہم انسان اچھا اور مناسب نہیں سمجھتے اور خود ستائی جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

لِلّٰہِ: قابل احترام ماہرین گرائمر ہمیں بتاتے ہیں کہ جب جملہ اسمیہ کی خبر کے مقام پر جملہ نما مرکب جار و مجرور ہو تو اُس سے قبل ایک فعل/اسم محذوف ہوتا ہے جو سیاق و سباق اور جملے میں استعمال ہوئے الفاظ سے سامع اور قاری کیلئے غیر مبہم انداز میں واضح ہوتا ہے۔
اَلْحَمْدُ میں ایک ایسی ہستی کا تصور موجود ہے جو اپنے سے بلند و برتر، عظمت و جلال کی حامل ہستی کا معترف ہوتا ہے، اور حرف جر ہمیں یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے اَلْحَمْدُ کو اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس کیلئے اول و آخر ہمیشہ کیلئے خلوص و محبت سے مختص و منسوب فرما دیا ہے۔ اِس حقیقت کو تخلیق کی ابتداء سے وجود لینے والے تمام موجودات کیلئے طے اور واضح کر دیا گیا ہے۔

رَبِّ ٱلۡعَـٰلَمِيـنَ: مرکب اضافی۔رَبِّ۔اسم معرفہ اضافت کی وجہ سے کیونکہ مضاف الیہ معرفہ ہے۔

**کلام کی فصاحت و بلاغت اور نقاستوں کا احساس کرتے، اور معنی اور مفہوم کو تمام جہتوں سے احاطہ ادراک میں لینے کیلئے ضروری ہے کہ ہمارا ذہن ہر ایک لفظ کی حیثیت اور اصلیت کا اپنے آپ بیک وقت تعین کرے۔** قرءانِ مجید میں عربی کا کلام شائد واحد کلام ہے جس کے الفاظ کی حیثیت اور اصلیت کا تعین محض دیکھنے،اور چند اصولوں کو ازبر کر لینے سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ لفظ واحد، مذکر، مجرور ہے۔یہ مجرور اِس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق مزید معلومات دینے کیلئے ''بدل'' ہے۔ **''بدل'' اپنے سے ماقبل اسم کے متعلق اضافی اطلاع دیتا ہے اور اِس کی تطری پہچان یہ ہے کہ جنس/gender، تعداد اور اعرابی حالت میں اُس اسم کے مطابق ہوتا ہے جس کیلئے یہ بدل ہے۔** ایسے ''بدل'' کو ''بَدَلُ الإِشْتِمَالِ'' کہتے ہیں جو مذکورہ ہستی کی پہچان ہے۔ اِس کا مادہ ''ر ب ب'' ہے۔یہ دو کے مابین ایک آقا اور بندے/غلام ؛مالک اور مملوک؛ خالق اور مخلوق؛مقتدر اور مسجود جیسے تعلق اور رشتے کا اظہار کرتا ہے جس میں رب اپنے بندے پر تمام نوازشات اور ہر طرح سے اُس کا خیال رکھنے کے ساتھ اُس کا احتساب کرنے اور اسے جزا اور سزا دینے پر غالب و مقتدر ہے۔

ٱلۡعَـٰلَمِيـنَ: مضاف الیہ ہے اور اگرچہ بظاہر زبر کے ساتھ منصوب ہے مگر جملے میں مجرور ہے کیونکہ مضاف الیہ حقیقی ہمیشہ مجرور ہوتا ہے۔ **چونکہ یہ عالم کا جمع سالم ہے اِس لئے مجرور اور منصوب حالت میں ہمیشہ زبر کے ساتھ ہوتا ہے۔** اور مرفوع حالت میں جمع سالم،واحد کے ساتھ ''ونَ'' کے اضافہ سے بناتے ہیں۔ جمع سالم بنانے کا یہ انداز خصوصی طور پر مذکر اسم فاعل کیلئے اختیار کیا جاتا ہے لیکن۔ٱلۡعَـٰلَمِيـنَ۔ایک مخصوص ندرت کا حامل لفظ ہے جس کا مادہ ''ع ل م'' ہے۔ علم ہمیشہ وجود اور موجود کا ہوتا ہے۔اِس لئے یہ لفظ اجتماعی طور پر تمام موجودات یعنی تخلیق کردہ سب کچھ کو احاطہ میں لیتا ہے۔ تخلیقات میں جو کچھ موجود ہے، موجود و معلوم تخلیق کردہ دنیاؤں /ہر ایک وجود پذیر کا رب/خالق، آقا، پروردگار، محتسب اللہ تعالیٰ ہیں۔

سبحان اللہ۔ کس قدر دانائی کی بات ہماری زبان سے ادا ہوئی۔ ہم نے نہ صرف اللہ تعالیٰ کو رب اللعالمین کے طور پہچاننے (recognizing) کا اعلان کیا بلکہ ہم نے مخلوق ہونے کا اقرار بھی کیا۔ ورنہ دنیا میں اُن کی بھی کمی نہیں جو اپنا تخلیق کیا جانا ہی تسلیم نہیں کرتے۔

نَحۡنُ خَلَقۡنَـٰكُمۡ

یہ ہم ہیں، ہم جناب نے تم لوگوں کو تخلیق کیا ہے۔

فَلَوۡلَا تُصَدِّقُونَ .٥٧

تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس قدر عیاں حقیقت کی تم لوگ برملا تصدیق نہیں کرتے!

أَفَرَءَيۡتُم مَّا تُمۡنُونَ .٥٨

تو کیا تم لوگوں نے اسے دیکھا ہے جسے تم دلدادگی سے نکالتے رہتے ہو؟

ءَأَنتُمۡ تَخۡلُقُونَهُۥٓ

کیا تم لوگ ہو جو اسے (مذکر/منی) باقاعدگی سے تخلیق کرتے رہتے ہو؟

أَمۡ نَحۡنُ ٱلۡخَـٰلِقُونَ .٥٩

یا ہم جناب اس کے ہمیشہ خالق ہیں؟ (غور کر کے جواب دو)(الواقعۃ۔۵۹)

ہم نے عالمین کے رب اللہ تعالیٰ کی حمد کر کے دانائی کا ثبوت دیا کہ تخلیق کردہ کو یہی زیبا ہے کہ اپنے خالق، رب کی حمد کرے۔ خالق اور تخلیق کے مابین تعلق کا تقدس یہ ہے کہ خالق اُس کیلئے الرحیم بنے اور تخلیق کردہ اپنے خالق کا ''احمد'' یعنی حمد کرنے والا بنے۔ اور جو اپنے خالق کا 'احمد' نہیں اور ''احمد'' کی اتباع کرنے والا نہیں وہ شر البریہ، بدترین انداز میں حریت کو استعمال کرنے والا کہلانے ہی کا مستحق ہے۔

اور جو ''احمد'' ہے انہیں خالق ''خلق عظیم'' یعنی اپنی سب سے عظیم تخلیق قرار دیتے ہیں (حوالہ القلم۔۴)۔ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑے قدر دان ہیں کہ ''احمد'' کو۔مَّقَامًا مَّحْمُودًا۔پر تشریف فرما/براجمان/فائز فرماتے ہیں (حوالہ الاسراء۔۷۹)۔اور تمام تخلیقات/موجودات کیلئے رحمت کا مجسم حالت میں اظہار کر دینے کے بعد انہیں واپس اُن کے مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔ یہ گمان پیدا نہ ہو کہ میں نے ترجمہ غلط کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ (مفعولا) پورا ہو کر رہتا ہے۔ اور جس وعدے نے پورا ہو کر رہنا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے پورا ہو چکا۔ آقائے نامدار ﷺ پر درود و سلام ہے ہر لمحہ صبح و شام۔

مجھے یقین ہے کہ یہ نکتہ واضح ہو گیا ہے کہ عربی لفظ ''حمد'' کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس، الرحمٰن ذالجلال والاکرام کیلئے منفرد اور مختص قرار دے دیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے احمد، اور ہمارے رہنما، آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کے مقام قیام کو۔مَّحْمُودًا [حَمْدٌ سے اسم مفعول کا صیغہ، واحد، مذکر] قرار دے کر طشت از بام کر دیا ہے کہ اُن کے بعد اُن کے ارادے اور فیصلے کے مطابق حمد کا استحقاق صرف اور صرف اس شخصیت کیلئے ہے۔ اور یہ نکتہ آپ ﷺ کے اسم گرامی سے بھی اپنے آپ عیاں ہے۔ اللہ تعالیٰ، اور مخلوقات میں آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور ہستی کیلئے لفظ ''حمد'' استعمال نہیں ہو گا۔ اُن کیلئے مدح، اور اردو کے لفظ تعریف/to appreciate/اظہار محبت و احترام و عقیدت کئے جائیں گے۔

ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ۔قرءان مجید یہ جملہ چھ بار ہے۔[ Recurrence:

[(1)1:02(2)6:45(3)10:10(4)37:182(5)39:75(6)40:65=6

ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ۔اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرما دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کر کے عظیم قرءان میں بتائے مخلص لوگوں کے انداز میں ہم نے دانائی کی بات کی۔

فَقُطِعَ دَابِرُ ٱلْقَوْمِ ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟

چونکہ حالات کے ردوبدل اور مہلت دیئے جانے کے باوجود وہ اپنی روش پر ڈھٹائی سے قائم رہے اس لئے مہلت کا وقت ختم ہونے پر ان لوگوں کے سلسلہ نسب کو صفحہ ہستی سے مٹا کر منقطع کر دیا گیا جنہوں نے حقیقت کے متضاد روش اور طرز عمل کو اپنا کر خود پر ظلم کیا تھا۔

وَ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٤٥﴾

اور اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرما دیا گیا ہے۔(الانعام۔۴۵)

---

دَعْوَىٰهُمْ فِيهَا سُبْحَٰنَكَ ٱللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَٰمٌ ۚ

ان کا ان میں رہتے ہوئے طرز عمل اس دعا سے ہو گا "آپ جناب عظیم ہیں! تمام عظمت و کبریائی اور جدوجہد کا محور آپ جناب ہیں، اے اللہ تعالیٰ''۔ اور ان میں رہتے ہوئے باہمی ملاقاتوں پر ایک دوسرے کے لئے نیک خواہشات اور خیر سگالی کا اظہار کریں گے۔

وَءَاخِرُ دَعْوَىٰهُمْ أَنِ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٠﴾

اور آخر میں جدا ہوتے وقت ان کے الفاظ یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرما دیا گیا ہے۔(سورۃ یونسؑ۔۱۰)

---

سُبۡحَٰنَ رَبِّكَ رَبِّ ٱلۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ١٨٠

آپ(ﷺ) کے رب حاجات سے بلند رتبہیں، تمام کبریائی ان کے لئے،اور تمام کوششوں کا وہ محور ہیں؛مطلق غلبہ و قوت والے مطلق رب،ان تمام باتوں سے منزہ اور مطلق عالی مرتبت ہیں جو وہ لوگ ان سے منسوب کرتے رہتے ہیں۔

وَسَلَٰمٌ عَلَى ٱلۡمُرۡسَلِينَ ١٨١

اورادب واحترام سے اللہ تعالیٰ کے ماضی میں بھیجے گئے تمام رسولوں پر سلام کہنالوگوں پر واجب ہے۔

وَٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ١٨٢

اور اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرمادیا گیا ہے۔وہ موجود و معلوم تخلیق کردہ دنیاؤں،ہر ایک وجود پذیر کے رب ہیں ۔(الصافات۔۱۸۲)

---

وَتَرَى ٱلۡمَلَٰٓئِكَةَ حَآفِّينَ مِنۡ حَوۡلِ ٱلۡعَرۡشِ

۔اور آپ(ﷺ) ملائکہ کو دیکھیں گے کہ تخت حکمرانی کے ارد گرد حلقے میں مصروف کار ہیں۔

يُسَبِّحُونَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡۚ

وہ ان جناب کو تمام جدوجہد کا محور اور منزل گردانتے ہمہ وقت ستائش کرتے برسرپیکار رہتے ہیں اپنے رب کی عظمت و برتری اور شرف و کبریائی کو بیان کرتے ہوئے۔

وَقُضِيَ بَيۡنَهُم بِٱلۡحَقِّ

اور لوگوں کے مابین مبنی بر حقیقت فیصلہ فرمادیا گیا۔

وَقِيلَ

اور اعلان ہوا:

ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ٧٥

"اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرمادیا گیا ہے۔وہ موجود و معلوم تخلیق کردہ دنیاؤں،ہر ایک وجود پذیر کے رب ہیں "۔(الزمر۔۷۵)

---

هُوَ ٱلۡحَيُّ

وہ جناب(رب العالمین)کامل حیات ہیں۔

لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ

اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت جان لو——ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں،سوائے ان(اللہ تعالیٰ) کے۔

فَٱدۡعُوهُ مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَۗ

چونکہ ان حقائق سے کوئی صاحب عقل بے بہرا نہیں اس لئے تم لوگ ان جناب کو پکارو اُن کے متعین کردہ آئین اور ضابطہ حیات/دین(اسلام) کے ساتھ مخلصانہ یکسوئی سے وابستہ رہتے ہوئے ۔

ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ٦٥

(اور اقرار کرو) اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرمادیا ہے [احمد ﷺ نے]۔(غافر۔٦٥)

---

ہم وہ حقیقت بیان کر رہے ہیں جس کا تعلق اُس جہاں سے ہے جسے ہم آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کی نگاہوں اور اُن کے ذریعے حاصل کردہ بصیرت سے نگاہ قلب سے دیکھ سکتے ہیں۔ **یہ بیان ابتدائے آفرینش ہی میں ازل سے ابد تک کے لئے طے کر دیا گیا تھا:**

وَهُوَ ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ

سب کچھ جاننے والے آپ (ﷺ) کے رب اللہ تعالیٰ ہیں۔ان کے متعلق یہ بدیہی حقیقت ہے—ان تمام کے تمام میں جنہیں معبود تصور کیا جاتا ہے کوئی ذی حیات نہیں، سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے۔

لَهُ ٱلۡحَمۡدُ فِي ٱلۡأُولَىٰ وَٱلۡأٓخِرَةِ ۖ

عظمت و برتری و شرف و کبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے ابتدائے آفرینش کے جہاں میں ان جناب کے لئے مختص اور استحقاق قرار دے دیا گیا تھا اور ایسا ہی جہان آخرت میں ہے۔

وَلَهُ ٱلۡحُكۡمُ

اور فرمان جاری کرنے اور حاکمیت اعلیٰ کا استحقاق ان جناب کے لئے مطلق ہے۔

وَإِلَيۡهِ تُرۡجَعُونَ ٧٠

متنبہ رہو؛ تم لوگ (یوم قیامت اپنی نسل کی باری پر مقررہ ساعت پر) ان کی جانب احتساب کیلئے پیش کئے جاؤ گے۔(القصص۔٧٠)

---

اور عالمین کے رب کون ہیں؟

ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ٣

ہر وجود پذیر کے رب الرّحمن عزوجل ہیں جو منبع رحمت ہیں۔(٣)

اس مقام پر۔ٱلرَّحۡمَٰنِ۔اپنے سے قبل۔رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ کا بدل ہے۔اللہ تعالیٰ کا بدل رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ اور رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ کا بدل ٱلرَّحۡمَٰنِ۔اس سے بھی واضح ہوا کہ دونوں ایک ہستی کے نام ہیں جن کی پہچان ہے رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ۔

اِس مرکب توصیفی کے متعلق ہم قبل ازیں آیت۔ا میں مطالعہ کر چکے ہیں۔
سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا یہ دہرانا/Repetition ہے؟ قطعی نہیں۔دہرانا اُس کو کہتے ہیں جب ایک ہی بات کی بلا مقصد تکرار کی جائے جو کلام/تحریر کے حسن کے منافی سمجھا جاتا ہے۔لیکن جب کوئی جملہ تحریر میں دوسری مرتبہ اس مقصد سے استعمال ہو کہ اُس کے ذریعے اضافی معلومات اور قبل ازیں بیان کردہ کو ایک دوسری سمت/جہت سے قاری کو دکھایا اور سمجھایا جائے تو اسے دہرانا نہیں کہتے۔یہ بیان میں خوبصورتی اور لطافت کے ساتھ قاری کیلئے قبل ازیں بیان کردہ کے متعلق التباس کی گنجائش نہیں رہنے دیتا۔قرءانِ مجید کا ایک منفرد انداز تصریف آیات ہے۔ایک تصور اور حقیقت کے متعلق معلومات کو آہستگی سے گھما گھما کر بیان کر دینے سے قاری کیلئے ممکن ہو جاتا ہے کہ اسے تمام جہتوں/زاویوں سے دیکھ لے؛ پرکھ لے جس پر تذبذب اور تشنگی کا کوئی پہلو اُس کیلئے باقی نہیں رہتا۔

ہم جہان آفرینش میں ہیں۔الرَّحمٰن ذوالجلال والاکرام نے اگر تخلیق کی ابتداءالرَّحیم بن کرنہ کی ہوتی تو کیا تمام کائنات اور جن وانس کی تخلیق محض ایک کھیل سے زیادہ اہمیت کی حامل قرار پاسکتی تھی؟ تمام کی تمام قوت وغلبہ کے سامنے ہر شئے اور ہستی کی حیثیت مجبورِ محض کی ہوتی کیونکہ جبر کے زیر اثر ہوتی اور ہماری تخلیق ہمارے ساتھ ایک مذاق سے زیادہ کچھ کہلاسکتی تھی؟

وَمَا خَلَقْنَا ٱلسَّمَآءَ وَٱلْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَٰعِبِينَ ﴿١٦﴾

متنبہ رہو؛ہم جناب نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین موجود ہے تفریح طبع اور دل لگی کرنے والوں کے انداز میں تخلیق نہیں فرمایا۔(الانبیاء۔١٦)

لَوْ أَرَدْنَآ أَن نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّٱتَّخَذْنَٰهُ مِن لَّدُنَّآ إِن كُنَّا فَٰعِلِينَ ﴿١٧﴾

اگر ہم جناب کا ارادہ کھیل تماشے کا شوق پورا کرنا ہوتا تو ہم جناب اسے اپنے علاقے میں اپنا لیتے اگر ہم ایسا کرنے والے ہوتے۔(الانبیاء۔١٧)

---

وَمَا خَلَقْنَا ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَٰعِبِينَ ﴿٣٨﴾

اور ہم جناب نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین موجود ہے تخلیق نہیں کیا ان کی طرح جو ایسا تفریح، وقت گزاری اور کھیل کھیل میں کرتے ہیں۔(الدخان۔٣٨)

اگر کائنات کو ایک کھیل اور مشغلے کے طور پر بنانا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو یہ کرنے کی ضرورت نہ تھی:

كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ ٱلرَّحْمَةَ

انہوں نے رحم وکرم کا شیوہ اپنے آپ پر لازم کر لیا تھا۔(حوالہ الانعام-١٢)

ساحل سمندر پر بچے ریت کے گھروندے بناتے ہیں۔وہ بھی تخلیق ہے لیکن کھیل کھیلنے والوں کی۔کائنات کی تخلیق کے متعلق بتایا:

خَلَقَ ٱللَّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ بِٱلْحَقِّ

۔اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو متعین مقصد، متعین سائنسی اصولوں اور متعین مدت کے تحت تخلیق کیا ہے۔

إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٤٤﴾

یقیناعینی مشاہدہ میں ہر وقت موجود ایسی شہادت اس منظم تخلیق کائنات میں ظاہر ہے جو خاص کر ایمان لانے والوں کے لئے فلسفہ توحید (معبود مطلق) کی جانب رہنمائی اشارہ کرنے والی ہے۔(العنکبوت۔٤٤)

آسمانوں اور زمین کی تخلیق کو۔بِٱلْحَقِّ۔قرار دیا گیا ہے۔اور اس حقیقت کو پھیر کر یوں بتایا:

وَمَا خَلَقْنَا ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ إِلَّا بِٱلْحَقِّ

اور ہم جناب نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین موجود کو سوائے متعین مقصد، متعین سائنسی اصولوں اور متعین مدت کے تحت تخلیق نہیں کیا ہے۔

وَإِنَّ ٱلسَّاعَةَ لَءَاتِيَةٌ

یہ حقیقت ہے کہ دنیاوی حیات کی مدت کی اختتامی ساعت پہنچ رہی ہے۔(حوالہ الحجر۔٨٥)

مَا خَلَقْنَٰهُمَآ إِلَّا بِٱلْحَقِّ

ہم جناب نے انہیں سوائے متعین مقصد، متعین سائنسی اصولوں اور متعین مدت کے تحت تخلیق نہیں کیا ہے۔

وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾

مگران کی اکثریت معلومات اور علم حاصل کرنے پر مائل ہی نہیں۔(الدخان۔۳۹)

بِٱلْحَقِّ۔ تخلیق کے معنی اور مفہوم یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کو ایک سوچے سمجھے ارادے، منصوبے اور عظیم مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا ٱلسَّمَآءَ وَٱلْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَٰطِلًا ۚ

متنبہ رہو؛ ہم جناب نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے مابین موجود ہے یونہی بلا مقصد اور قصد تخلیق نہیں فرمایا ہے۔

ذَٰلِكَ ظَنُّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ۚ

یہ بلا قصد موجود ہونے کا گمان ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے ہی کا انکار کیا ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِنَ ٱلنَّارِ ﴿٢٧﴾

چونکہ عقل و فہم کے لئے بدیہی حقیقت سے انکار محض جاذبیت دنیا سے ہے اس لئے انجام کار خود اپنی مذمت و ملال ان لوگوں کا روزمرہ کا معمول ہوگا جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور یوم قیامت کا انکار کیا ہے جب جہنم کی تپش سے جھلس رہے ہوں گے۔(سورۃ ص۔۲۷)

انسان کو بھی بتایا گیا:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَٰكُمْ عَبَثًا

کیا اس دن کے متعلق لاپرواہی اس وجہ سے تھی کہ تم لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ہم جناب نے تم لوگوں کو یونہی بے مقصد تخلیق کیا تھا۔

وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ﴿١١٥﴾

اور یہ کہ تم لوگوں کو ہمارے حضور احتساب کے لئے پیش نہیں کیا جائے گا"۔(المومنون۔۱۱۵)

---

أَيَحْسَبُ ٱلْإِنسَٰنُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾

کیا بعض انسان یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ اسے ترک کر دیا جائے گا، آزاد منش حال میں؟(القیامۃ۔۳۶)

بے مقصد اور کھیل کھیلتے ہوئے کسی شئے کو بنانے میں ارادے اور خواہش کا عنصر غالب نہیں ہوتا۔ بامقصد تخلیق خواہش اور ارادے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

بَدِيعُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ

وہ جناب آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود دینے والے ہیں۔

وَإِذَا قَضَىٰٓ أَمْرًا

اور جب وہ جناب کسی بھی امر/معاملے کو نبٹا دینے کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُنۡ

تو وہ جناب اُس (امر) کے لئے صرف اتنا کہہ دیتے ہیں ''تو مادی دنیا میں وجود پذیر ہو جا''

فَيَكُونُ ١١٧

تکمیل حکم میں وہ (امر؛ شئے، ذی حیات، وقوعہ) مادی دنیا کے لئے وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ (البقرۃ۔۱۱۷)

---

إِنَّمَا قَوۡلُنَا لِشَيۡءٍ إِذَآ أَرَدۡنَٰهُ

یہ صرف ہم جناب کے کسی بھی مادّیات کے لئے جاری کردہ فرمان کا خاصہ ہے کہ جب ہم نے اس کو ظہور پذیر کرنے کا ارادہ فرمالیا ہے:

أَن نَّقُولَ لَهُۥ كُن

تو ہم جناب کا اُس شئے کے لئے یہ کہنا کافی ہوتا ہے ''تو مادی دنیا میں وجود پذیر ہو جا''۔

فَيَكُونُ ٤٠

تکمیل حکم میں وہ (امر؛ شئے، ذی حیات، وقوعہ) مادی دنیا کے لئے وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ (النحل۔۴۰)

---

إِنَّمَآ أَمۡرُهُۥٓ إِذَآ أَرَادَ شَيۡـًٔا

یہ صرف ان جناب کے حکم کا خاصہ ہے کہ جب انہوں نے کسی بھی مادّیات کو ظہور پذیر کرنے کا ارادہ فرمالیا ہے

أَن يَقُولَ لَهُۥ كُن

تو ان جناب کا اُس شئے کے لئے یہ کہنا کافی ہوتا ہے ''تو مادی دنیا میں وجود پذیر ہو جا''۔

فَيَكُونُ ٨٢

تکمیل حکم میں وہ (امر؛ شئے، ذی حیات، وقوعہ) مادی دنیا کے لئے وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ (یٰسٓ۔۸۲)

کائنات کی تخلیق کا انتہائی مقصد انسان کی تخلیق تھا۔ اور انسان کی تخلیق کا مقصد؟

وَهُوَ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَ فِى سِتَّةِ أَيَّامٍ

اور وہی جناب ہیں جنہوں نے سات آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا ہے، اس کائنات کے باہر کے وقت کے شمار سے چھ دنوں میں۔

وَكَانَ عَرۡشُهُۥ عَلَى ٱلۡمَآءِ

۔۔اور ان جناب کا عرش/یکتا تخت اقتدار پانی کے ذخیرہ سے اوپر کے مقام پر ہے۔۔

لِيَبۡلُوَكُمۡ أَيُّكُمۡ أَحۡسَنُ عَمَلًا ۗ

اس تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ جناب تم لوگوں کو آزمائش میں مبتلا کر کے یہ ظاہر کر دیں کہ تم لوگوں میں سے کون بہتر حسن واعتدال کا حامل ہے، بہتر حسن عمل کے حوالے سے۔ (حوالہ سورۃ ھودؑ۔۷)

---

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى ٱلْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا

یہ حقیقت ہے کہ ہم جناب نے اسے جو زمین کے اوپر موجود ہے اس کے لئے باعث کشش و آرائش بنایا ہے۔

لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝٧

اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم جناب ان لوگوں کو آزمائش میں مبتلا کر کے یہ ظاہر کر دیں کہ ان میں سے کون بہتر حسن و اعتدال کا حامل ہے، بہتر حسن عمل کے حوالے سے۔(الکہف۔۷)

---

ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلْمَوْتَ وَٱلْحَيَوٰةَ

اس ذات کو صرف دوام و ثبات ہے جنہوں نے مادے اور حیات کو تخلیق فرمایا ہے۔

لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۚ

اس تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ جناب تم لوگوں کو آزمائش میں مبتلا کر کے یہ ظاہر کر دیں کہ تم لوگوں میں سے کون بہتر حسن و اعتدال کا حامل ہے بہتر حسن عمل کے حوالے سے۔

وَهُوَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْغَفُورُ ۝٢

اور وہ جناب دائمی، ہر لحہ، ہر مقام پر مطلق غالب ہیں، وہ اکثر و بیشتر در گزر کرنے، پردہ پوشی اور معاف فرمانے والے ہیں۔(الملک۔۲)

انسان کیلئے وسیع تر معنی اور مفہوم میں اَحْسَنُ عَمَلًا کیا ہے؟ اس کا مفہوم وہی ہو سکتا ہے جو جن و انس کی تخلیق کا مقصد ہو۔ فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ ٱلْجِنَّ وَٱلْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝٥٦

اور میں نے جن و انس کو صرف اِس لئے تخلیق کیا ہے کہ وہ بطیب خاطر میری بندگی / محکومی کریں۔(الذاریات۔۵۶)

اللہ تعالیٰ کے کلام کے ابتدائی دس الفاظ میں دو بار مرکب توصیفی۔ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ۔ نے انسان کیلئے کائنات کی تخلیق کے اصول کو واضح کر دیا کہ یہ طاقت اور جبر کا کھیل نہیں۔ انسان جانتا ہے کہ طاقت اور جبر کے کھیل میں رحمت کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ طاقت اور جبر کا اصول جب پیش نظر ہو تو اس میں رحمت کو داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ کائنات کی تخلیق انسان کیلئے ہے اور انسان کی تخلیق اِس خواہش کا نتیجہ ہے کہ رضا و رغبت اور محبت سے اپنے خالق، رب کی بندگی کرے۔ طاقت اور غلبے کے بل بوطے پر طاقتور کا اپنے آپ کو آقا اور مالک منوانا تو اتنی بڑی بات نہیں۔ طاقت نے اگر اپنے آپ کو محبت اور شوق سے منوانا ہے تو طاقت کو اپنے آپ پر رحمت کو واجب کرنا ضروری ہے۔ اللہ، الرحمٰن کا الرحیم ہونا بعض لوگوں کے اختراع کردہ فلسفہ جبر و قدر کی نفی بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق ارشاد فرمایا:

هُوَ ٱلْأَوَّلُ وَٱلْآخِرُ

وہ جناب موجودگی کے حوالے سے اول ہیں اور آخر بھی وہ جناب ہی ہیں۔

وَٱلظَّٰهِرُ وَٱلْبَاطِنُ ۖ

وہ جناب بیک وقت ہر جگہ موجود ہیں؛ اپنے موجود ہونے کا اظہار کرنے والے ہیں؛ اور اپنے آپ کو بصارتوں سے پوشیدہ رکھنے والے ہیں۔

وَهُوَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٌ ٣

اور وہ جناب ہر ایک شئے کا مکمل دائمی علم رکھنے والے ہیں۔(الحدید۔۳)

ذات، ہستی کا ایک ظاہر ہے۔ جس ہستی اور شئے کا ظاہر نہیں وہ موجود نہیں۔ اور جو موجود نہیں اسے (وَجَد) پایا نہیں جاسکتا۔ اور اس اول از خود سے موجود نے ہر شئے کو وجود اور شناخت دیا:

هُوَ ٱللَّهُ ٱلۡخَٰلِقُ ٱلۡبَارِئُ ٱلۡمُصَوِّرُ

وہ جناب (الرَّحمٰن) اللہ تعالیٰ ہیں۔ وہ عدم سے مادّیات کو تخلیق کرنے والے ہیں۔ عناصر کو الگ کرنے اور تحفظ دینے والے ہیں؛ وہ جناب ہر شئے کو انوکھی صورت اور چہرہ عنایت کرنے والے ہیں۔

لَهُ ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰۚ

بدرجہ اتم خصوصیات، توازن و حسن، کبریائی کو بیان کرتے اسماء صرف اور صرف ان (الرحمٰن ذالجلال والاکرام) کے لئے مختص اور شایان شان ہیں۔

يُسَبِّحُ لَهُۥ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۖ

یہ حقیقت ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں موجود ہے اور جو کچھ زمین میں موجود ہے ان جناب کو مطلق عظمت و کبریائی اور جدوجہد کا محور اور منزل مقصود قرار دیتے ہوئے اپنی ذمہ داری کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے برسرپیکار ہیں۔

وَهُوَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلۡحَكِيمُ ٢٤

مطلع رہو؛ ان کے بارے حقیقت یہ ہے کہ وہ جناب دائمی، ہر لمحہ، ہر مقام پر مطلق غالب ہیں۔ اور بدرجہ اتم انصاف پسند تمام موجود کائنات کے فرمانروا اور تمام پنہاں کو جاننے والے ہیں۔(الحشر۔۲۴)

اللہ یکتا ہیں کہ کوئی دوسرا عدم سے شئے کو تخلیق نہیں کر سکتا۔ اور یہ تمام تخلیق کس کیلئے ہے؟

أَلَمۡ تَرَوۡاْ أَنَّ ٱللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلۡأَرۡضِ

کیا تم لوگوں نے اس حقیقت کا مشاہدہ نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں موجود ہے اور جو کچھ زمین میں موجود ہے اسے ان جناب نے تمہارے لئے قابل دسترس حالت میں کیا ہے۔

وَأَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهُۥ ظَٰهِرَةً وَبَاطِنَةًۗ

اور ان جناب نے اپنی لاتعداد نعمتوں کو تم لوگوں پر نچھاور فرمایا ہے؛ ہر کسی کے لئے عیاں ہیں اور پنہاں، تاثیری حوالے سے بھی ہیں۔

وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُجَٰدِلُ فِى ٱللَّهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ

مگر اس کے باوجود ایک ایسا بدگمان اور بدزبان شخص لوگوں میں موجود ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق معلومات اور ٹھوس علم کے علاوہ ہرزہ سرائی پر مشتمل باتوں کے پیچ و خم سے الجھتا رہتا ہے۔

وَلَا هُدًى وَلَا كِتَٰبٍ مُّنِيرٍ ٢٠

اور مزید وہ ایسا اس حال میں کرتا ہے کہ نہ اسے کسی سے رہنمائی حاصل ہے اور نہ بصیرت افروز کتاب پر اسے دسترس ہے۔(لقمان۔۲۰)

ہستی اور کائنات کی ہر شئے کا ''الظاہر'' ہے اور ''الباطن'' ہے۔ اگر شئے کا ''الظاہر'' نہیں تو ''الباطن'' بھی عدم ہے۔ پھل کی شکل، رنگ، خوشبو اور ذائقہ نعمتِ ظاہرہ اور فرحت و قوت، تاثیر اس میں نعمتِ باطن (پنہاں) ہے جو بعد ازاں ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ سب کچھ جس کیلئے تخلیق کیا اُسے اِس کی حقیقت کا ادراک دینے کیلئے سماعتوں، بصارتوں اور قلب و ذہن کی صلاحیتوں سے مزین کر کے اس دنیا میں داخل کیا۔ انسان دنیا میں اپنی آمد پر کسی شئے کا علم نہیں رکھتا لیکن اللہ تعالیٰ نے سماعتوں اور بصارتوں کے ذریعے ملنے والی خبر، اطلاع اور علم پر سوچنے سمجھنے، غور و فکر کیلئے دل و دماغ عطا فرمائے کہ خبر اور اطلاع پر سوچ بچار، غور و خوض اور تفکر کے بعد نتائج، اصول، قانون، نصیحت حاصل کر کے یقین کی حالت میں پہنچنے کی صلاحیت انسان کو کائنات کے تمام مادے اور حیات سے ممیز اور ممتاز کر دیتی ہے۔

وَ ٱللَّهُ أَخۡرَجَكُم مِّنۢ بُطُونِ أُمَّهَٰتِكُمۡ

اور اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو تمہاری ماؤں کے بطن سے خارج کیا تھا۔

لَا تَعۡلَمُونَ شَيۡـٔٗا

اس حال میں کہ تم لوگ کسی شئے کے متعلق معلومات اور علم نہیں رکھتے تھے۔

وَ جَعَلَ لَكُمُ ٱلسَّمۡعَ وَ ٱلۡأَبۡصَٰرَ وَ ٱلۡأَفۡـِٔدَةَۙ

اور انہوں نے تمہارے ایک جزو کو تمہارے لئے سماعت کی لیاقت بنا دیا، اور بصارتوں کا ذریعہ، اور (قلیل تعداد میں) معلومات کو منظم / پکانے والے دماغ۔

لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُونَ ٧٨

مقصد یہ تھا کہ علم حاصل ہو جانے پر تم لوگ اظہار تشکر کرو۔ (النحل۔ ۷۸)

انسان۔ لَا تَعۡلَمُونَ شَيۡـٔٗا۔ کے مقام سے ابھرتے اور اشیاء کے اسماء کا علم حاصل کرتے ہوئے۔ تَعۡلَمُونَ ''جانتے، علم رکھتے ہیں'' کے مقام پر پہنچتا ہے۔ علم ظاہر سے باطن تک پہنچنے کا نام ہے۔ پھر اپنے خالق کا علم انسان کیسے حاصل کرے؟

لَّا تُدۡرِكُهُ ٱلۡأَبۡصَٰرُ

بصارتیں ان جناب کو متصور نہیں کر سکتیں۔

وَهُوَ يُدۡرِكُ ٱلۡأَبۡصَٰرَ

اور وہ جناب بصارتوں کا ان کی پہنچ تک پیچھا کرتے ہیں۔

وَهُوَ ٱللَّطِيفُ ٱلۡخَبِيرُ ١٠٣

وہ جناب تمام تر نفاست،، لطافت اور باریک بینی سے مشاہدہ کرنے والے ہر لمحہ ہر شئے سے باخبر ہیں۔ (الانعام۔ ۱۰۳)

ظاہر سے باطن، پنہاں کا علم اشیاء کے مابین تعلق، رشتے (relationship) کو دیکھنے اور جاننے سے ہوتا ہے۔ انسان کا علم ظاہر سے باطن کی جانب سفر کرتا ہے لیکن علم باطن سے ابتدا نہیں کر سکتا کہ وہ علم نہیں تخیل ہو گا۔ یہ انسان کی بظاہر کمزوری اور محدودیت ہے لیکن حقیقت میں اس کے مخلوق ہونے کا یہ ثبوت ہے اور اس کا شرف بھی۔ خالق، اللہ رب العزت نے اپنے پنہاں (باطن) کو ظاہر کر دیا کیونکہ اُن کا ظاہر انسان کی بصارتوں کیلئے ظاہر نہیں بلکہ پنہاں ہے۔ مخلوق کا وجود ظاہر اور اس کی حقیقت، باطن نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے اس لئے کسی بھی ظاہر مخلوق اور شئے (کائنات) کے باطن کو جاننے میں تشنگی کا عنصر ہمیشہ غالب رہے گا کہ مجاز سے حقیقت تک نہیں پہنچا جا

سکتا۔

لیکن جس موجود کا باطن، پنہاں ظاہر ہو اس کے متعلق جاننے اور علم میں تشنگی کا عنصر قطعی طور پر موجود نہیں ہوتا۔ **وہ ظاہر سے بھی زیادہ ظاہر ہوتا ہے پھر بھی مجاز نہیں ہوتا کیونکہ بصارت اس حقیقت کو پا نہیں سکتی اور اگر حقیقت مجاز میں آئے تو عام انسان کو سوائے التباس کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ انسان کا یقین پنہاں کو جاننے کا محتاج ہے۔** جس انسان کو حقیقت شئے، پنہاں پر یقین نہیں وہ شئے کے وجود کو کیونکر مان سکتا ہے؟ حقیقتِ شئے اس شئے کے مقصد کو ظاہر کر دیتی ہے۔ اور مقصدِ شئے اس شئے کے خالق کے ارادے کو ظاہر کر دیتا ہے۔ جنہیں اپنے ارد گرد کی تمام تخلیق بامقصد دکھائی دے انہیں یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ طاقت اور قوت کے اوپر رحمت ہی رحمت چھائی ہوئی ہے۔ اس لئے وہی لوگ اپنے رب، الرّحمٰن کو بن دیکھے مانتے اور ان سے ڈرتے ہیں کیونکہ اتنا فہم تو ہر کسی کا ہے کہ قوت و غلبے کے باوجود جو الرحیم ہے وہ آخر ایک دن ضرور پوچھے گا کہ سیانے جانتے ہیں کہ بامقصد تخلیق ایک متعین انجام کیلئے ہوتی ہے۔ اس لئے دانا و بینا لوگ اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مَـٰلِكِ يَوۡمِ ٱلدِّينِ ٤

وہ (الرّحمن عزوجل) جزا و سزا دیئے جانے کے دن کے مقتدر و منصف ہیں۔ (۴)

یہ کہہ کر حقیقت کو بیان کرنے کا شرف ہم نے حاصل کیا۔ **حقیقت کو بیان کرنا دانائی اور حکمت کا اظہار اور کائنات میں مہک بکھیرنے کے مترادف ہے۔**

یہ تین الفاظ دو مرکب اضافی ہیں۔ قرءانِ مجید میں یہ صرف ایک مرتبہ ہیں۔ اور ان میں جس بات کا ذکر ہے وہ بھی صرف ایک مرتبہ واقعہ ہوا ہے۔

۔مَـٰلِكِ۔ اسم فاعل کا صیغہ ہے، معرفہ بسبب اضافت، واحد، مذکر، مجرور۔ یہ ٱلرَّحۡمَـٰنِ ٱلرَّحِيمِ .کا ''بَدَلُ الإِشْتِمَالِ'' ہے اور مضاف ہے۔ اس بدل میں اُس خصوصیت، فعالیت اور منصب (**حیثیت موجودہ اور ضابطۂ اخلاق کے اعتبار سے حق، حیثیت، رتبہ، درجہ**) کو جو مذکورہ ہستی کا اشتمال ہے بیان کیا جاتا ہے۔ الرّحمٰن الرحیم کو ہم نے ان کی دوسری پہچان (recognition)۔ سے بیان کیا ہے۔

۔يَوۡمِ۔ مضاف الیہ ہے اور پھر مضاف ہے، معرفہ بسبب اضافت، واحد، مذکر، مجرور۔ اور معنی ہیں ''خاص/متعین/کہنے اور سننے والے دونوں کے تصور میں جانا پہچانا دن''۔

ٱلدِّينِ۔ مضاف الیہ، معرفہ باللام۔ یہ فعل ''دَانَ، يَدِينُ'' کا مصدر ہے۔ اِس کا مادہ ''د ی ن'' ہے۔ **اِس میں سمو یا تصور اور معنی غلبہ، اقتدار، حکومت، آئین، قانون، نظم و نسق، نظام، معاشرت، اطاعت و فرمانبرداری، روش، ضابطہ حیات، جزا و سزا ہیں۔** ہمیں بظاہر دکھائی دیتا ہے کہ۔ ٱلدِّينِ۔ کے معنی ایک سے زیادہ ہیں لیکن اِن تمام الفاظ پر اپنے معاشرے اور ریاست کے حوالے سے بھی معمولی غور کر لیں تو حقیقت ہم پر واضح ہو جائے گی کہ یہ تمام آپس میں منسلک ہیں اور اُن کے درمیان ایک ایسا تعلق اور نسبت ہے جو لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ **اگر ایک لفظ میں انہیں سمیٹنا ہو تو یوں کہیں گے ''نظام حیات و کائنات''**۔ اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ نظامِ حیات و کائنات کو طے اور مرتب کرنے کا اختیار، قوت اور غلبہ اُن کے ہاتھ ہو گا جنہوں نے حیات و کائنات کو تخلیق فرمایا ہے۔ کائنات کی تخلیق ایک ایسی حقیقت ہے جس کے متعلق مشرکین بھی کہتے ہیں کہ بلاشبہ یہ قوت و غلبہ کے مالک اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے:

إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلۡإِسۡلَـٰمُۗ

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حیات و کائنات کیلئے وضع اور مقرر کردہ دستور اور نظام صرف اسلام ہے۔ (حوالہ ءالِ عمران۔۱۹)

ٱلۡإِسۡلَـٰمُ۔ یہ بھی باب افعال سے مصدر ہے مگر اِس کے فعل متعدی نہیں بلکہ لازم ہے۔ مصدر، زمان کے حوالے/صیغے کے بغیر فعل و عمل، حالت، میکنزم، نظم، نظام کا اظہار کرتا ہے۔ اور اِس کا مادہ ''س ل م'' ہے جس میں سمو یا بنیادی تصور کسی شئے اور ہستی کا اپنے آپ کو کسی دوسرے کے پسند، متعین کردہ طریقہ کار، نظام کا پابند و مکلف بنا

لیناہے، چاہے چاہت ورغبت کے احساس وجذبہ سے ہو یاماحول اور موجودات کے منفی تعلق واثرات کے جبر کے زیر اثر اُس متعین کردہ نظام کا حصہ بننا پڑے۔ یہ دو طرح کے اندازاِس مصدر کے غیر متعدی ہونے سے بھی عیاں ہیں۔

أَفَغَيۡرَ دِينِ ٱللَّهِ يَبۡغُونَ

مگر کیاوہ لوگ اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ نظام کے علاوہ کسی دوسرے طریقہ کار کے متلاشی رہتے ہیں؟

وَلَهُۥٓ أَسۡلَمَ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ طَوۡعٗا وَكَرۡهٗا

باوجوداِس روشن حقیقت کی موجودگی/حال میں کہ جو کوئی ذی حیات آسمانوں اور زمین میں موجود ہے درحقیقت اُس نے اپنے آپ کواُن/اللہ تعالیٰ کیلئے پابند ومکلف/فرمانبردار/خود سپردگی میں دیاہے، چاہے چاہت ورغبت وکشش کے زیر اثر اور چاہے نظام کی مجبوری اور ناگواری جبر کے زیر اثر۔

وَإِلَيۡهِ يُرۡجَعُونَ ٨٣

اور ان جناب کی جانب احتساب کیلئے انہیں پیش کیا جائے گا۔(ءالِ عمران۔۸۳)

اللہ تعالیٰ کا ذی حیات کیلئے۔دِينِ ٱللَّهِ۔وضع کردہ نظام صرف اور صرف اسلام ہے۔یعنی اختیار، ارادہ، قوت فعل وعمل، حیات کے تمام پہلواور جہتوں کو مربوط انداز میں زیر نگیں اور سپردگی میں دے دینا؛ عطا کردہ حریت کو رضاورغبت سے بتائے گئے نظام کی حدود وقیود میں مقید ومحدود کردینا، عربی زبان کے مصدر اسلام میں سموئے تصور کا متحرک اور عملی مظاہرہ ہے۔اوراِس نظام کو رضاورغبت سے تسلیم کرنے اور اُس پر حیات کو متحرک رکھنے کا انتہائی مظاہرہ اُس نظام کو مرتب اور پسند کرنے والے کے حضور ذی حیات کا سربسجود ہو جاناہے جو عطا کردہ حریت کو عطا کرنے والے کے حضور ٹیک/سرنڈر[complete surrender]کردینے کا تمام کیلئے مشہود اظہار ہے۔ہستی کیلئے اور اُس کے سامنے سرنگوں ہونا ہوتا ہے۔ہستی کے سامنے سجدہ ریز ہوا جاتا ہے۔سجدہ ذات کو ہے صفات کو نہیں۔

وَلِلَّهِ يَسۡجُدُ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ طَوۡعٗا وَكَرۡهٗا

مطلع رہو؛ جو کوئی ذی حیات آسمانوں اور زمین میں موجود ہے، وہ چاہے چاہت ورغبت وکشش کے زیر اثر اور چاہے نظام کی مجبوری اور ناگواری جبر کے زیر اثر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتا رہتا ہے۔

وَظِلَٰلُهُم بِٱلۡغُدُوِّ وَٱلۡأٓصَالِ ۩ ١٥

تاہم اُن کے سائے سجدہ ریز ہوتے ہیں علی الصبح اور دن کے آخری پہر کے اوقات میں۔(بحثیت فعل سجدہ کے فاعل سایہ اپنے آپ میں ایک حقیقت ہے)(الرعد۔۱۵)۔(آیت سجدہ ہے، سجدہ کریں)

---

وَلِلَّهِ يَسۡجُدُ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلۡأَرۡضِ مِن دَآبَّةٖ

اور یہ جان لو کہ جانوروں میں سے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں حیات ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے۔

وَٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ وَهُمۡ لَا يَسۡتَكۡبِرُونَ ٤٩

اور ملائکہ سجدہ کرتے ہیں، اور وہ کبھی قابل تعظیم اور اعلیٰ وارفع تسلیم کئے جانے کے خواہش مند نہیں ہوتے۔

يَخَافُونَ رَبَّهُم مِّن فَوۡقِهِمۡ

وہ اس حال میں ہوتے ہیں کہ اپنے رب کا خوف ہر وقت محسوس کرتے ہیں، اور سہمے رہتے ہیں کہ کہیں ان کے اوپر سے عذاب نہ آن پڑے۔

وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ ۵۰

اور وہ تمام اس فعل کو انجام دیتے ہیں جس کو انجام دینے کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔(النحل۔50۔آیت سجدہ ہے)

---

أَلَمْ تَرَ أَنَّ ٱللَّهَ يَسْجُدُ لَهُۥ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِى ٱلْأَرْضِ

کیا آپ(ﷺ) نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ہیں جن کے لئے جو کوئی آسمانوں میں ذی حیات موجود ہے اور جو کوئی زمین میں ذی حیات موجود ہے دل کی شاد سے سر بسجود ہوتا ہے اور نظام کی مجبوری اور ناگواری جبر کے زیر اثر سرنگوں ہو گا۔

وَٱلشَّمْسُ وَٱلْقَمَرُ وَٱلنُّجُومُ

اور سورج اور چاند اور ستارے ان جناب کے لئے مطیع سجدہ ریز رہتے ہیں۔

وَٱلْجِبَالُ وَٱلشَّجَرُ وَٱلدَّوَآبُّ

اور تمام پہاڑ اور تمام درخت اور تمام جانور ان جناب کے لئے مطیع سجدہ ریز رہتے ہیں۔

وَكَثِيرٌ مِّنَ ٱلنَّاسِ ۖ

اور انسانوں میں سے بھی ایک کثیر تعداد ان جناب کے حضور سجدہ ریز ہوتی ہے۔

وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ ٱلْعَذَابُ ۗ

اور جبکہ ان (انسانوں) کی کثیر تعداد پر منفرد عذاب مستوجب ہو گیا ہے۔(حوالہ الحج۔۱۸)

''يَسْجُدُ''واحد مذکر غائب مضارع مرفوع۔مادہ''س ج د''جس کے بنیادی معنی پست ہونا، جھک جانا ہیں(ابن فارس)۔پست ہونے اور جھک جانے سے شئے پیمانوں /ایک متعین طریقے میں محدود ہو جاتی ہے جو تکبر کی ضد ہے۔تکبر محدودیت کو تسلیم کرنے سے انکار اور متعین پیمانے اور طریقے سے باہر ہونے کا نام ہے۔''سجدہ''اور ''تکبر''ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔

**دِينِ ٱللَّهِ۔اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ نظام کیا ہے؟**

اللہ تعالیٰ کے حضور تمام کی تمام کائنات۔طَوْعًا وَكَرْهًا۔''يَسْجُدُ''ہے۔یہ۔دِينِ ٱللَّهِ۔ہے۔اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کائنات میں ہر ذی حیات۔طَوْعًا وَكَرْهًا۔''أَسْلَمَ''ہے۔اور جو کوئی أَسْلَمَ۔ہے وہ ۔دِينِ ٱللَّهِ۔پر ہے۔اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔ٱلدِّينُ۔صرف۔ٱلْإِسْلَٰمُ۔ہے اور اس دین پر کائنات کی ہر شئے کاربند ہے۔

کائنات کی ہر شئے فرمانبردار ہے، چاہت و رغبت سے اور انتہائی مربوط نظام کا جزو ہونے کی مجبوری کی بناء پر۔یہ اُس کی فطرت ہے یہ اُس کی تقدیر ہے۔**فرمانبرداری کائنات کے تسلسل اور وجود کی ضامن ہے**۔کائنات کی ہر شئے کی مقدار ہے۔پیمانہ ہے۔زوج ہے؛ایک دوسرے کیلئے معاون و مددگار اور تکمیل کا سبب کہ ایک دوسرے کے بغیر ادھورا ہے۔اور تمام اشیاء کی آپس میں موزوں نسبت، تقدیر ہے۔ایک دوسرے سے مربوط و منظم ہیں۔ہر ایک دوسرے سے جدا اور منفرد لیکن معمولی دھیان سے بھی دیکھیں تو سب ایک اکائی نظر آئیں گے۔یہ اُن کی تقدیر ہے۔یہ اُن کی فطرت ہے۔یہ اُن کے۔ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ۔یعنی دوام و ثبات کے حامل نظام کے زیر اثر ہونے کا مظاہرہ ہے۔یہ اُن کے''يَسْجُدُ''اور۔أَسْلَمَ۔ہونے پر دلیل ہے۔اسلام میں تفرقہ نہیں۔وہ۔دِينِ ٱللَّهِ۔پر ہیں۔کائنات۔ٱلْإِسْلَٰمُ۔کی پیروکار ہے۔

سبحان اللہ! کائنات کو اسلام کی پیروکار بنانے میں کمال یہ ہے کہ یہ الرّحیم بن کر تخلیق کی گئی کیونکہ یہ تخلیق کسی اور کے لئے ہے۔

هُوَ ٱلَّذِى خَلَقَ لَكُم مَّا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا

وہی ایک جناب ہیں جنہوں نے جو کچھ بھی زمین میں ہے تمام کا تمام، مجموعی طور تم لوگوں کی خاطر تخلیق فرمایا۔(حوالہ البقرۃ۔۲۹)

---

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ

کیا تم نے اس حقیقت کا مشاہدہ نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں موجود ہے اور جو کچھ زمین میں موجود ہے اسے ان جناب نے تم لوگوں کے لئے قابل دسترس حالت میں کیا ہے۔ مجموعی طور پر، یہ ان کی جانب سے اظہار رحمت ہے۔

إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١٣﴾

یقیناان عناصر فطرت کے عینی مشاہدہ میں ایسی شہادتیں ہیں جو از خود تفکر کرنے والوں کے لئے فلسفہ توحید (معبود مطلق) کی جانب رہنمائی/اشارہ کرنے والی ہیں ۔(الجاثیہ۔۱۳)

سبحان اللہ! الحمدللہ! کائنات کو اسلام یعنی۔دِينِ ٱللَّهِ۔پر پابند ہمارے لئے کیا گیا ہے۔"يَسْجُدُ"اور۔أَسْلَمَ۔ہونے کی بناء پر ہی ہمارے لئے مسخر ہے۔وہ کائنات "يَسْجُدُ"اور۔أَسْلَمَ۔ہے جسے تخلیق بھی ہمارے لئے کیا گیا اور مسخر بھی ہمارے لئے کر دیا گیا۔ ہمیں دیئے گئے علم کے مطابق ہماری تخلیق سے قبل کائنات کے علاوہ دو مخلوقات اور بھی موجود تھیں، ملائکہ اور جنات جن میں سے ابلیس بھی ہے۔آدم علیہ السلام کیلئے تمام ملائکہ محبت وقربت کے جذبے سے سرشار مجسم تعظیم ہو گئے؛ اور اللہ تعالیٰ، الرّحمن ذالجلال والاکرام کی رحمت کو واجب کر کے تخلیق کی ابتدا کی ہوئی کائنات اور مخلوقات میں سے ایک نے آدم کیلئے "اُسْجُدُ"، تعظیم بجالانے، سرنگوں اور پست ہونے سے انکار کر دیا۔انجام گھٹیا قرار پایا اور دھتکار دیا گیا۔اللہ اکبر! اللہ اکبر!

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حیات وکائنات کیلئے وضع اور مقرر کردہ نظام صرف اسلام ہے۔اِس کے باوجود، عطا کردہ حریت اور ارادہ اور قوتِ فیصلہ کے زعم میں کوئی کسی غلط فہمی میں نہ رہے، یہ واضح کر دیا گیا۔

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ ٱلْإِسْلَٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ

متنبہ رہو؛ جو کوئی دانستہ زیر مقصد اسلام کے بجز کسی آئین/نظام حیات کو بطور دستور اپنانے کا خواہشمند ہو گا تو کبھی بھی اس کی جانب سے قبول کیا جائے گا۔

وَهُوَ فِى ٱلْءَاخِرَةِ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٨٥﴾

اور وہ شخص آخرت میں اپنا خسارہ کرنے والوں میں سے ایک ہو گا۔(ءالِ عمران۔۸۵)

ہم نے اللہ تعالیٰ اور دنیا کو بتایا کہ ہمیں اقرار ہے کہ فیصلے کا ایک دن ہے، یوم حساب ہے جب تمام جن وانس کا احتساب ہو گا اور اُس دن کے مالک، مقتدر اور منصفِ اعلیٰ الرّحمن ذالجلال والاکرام ہیں کیونکہ **فیصلہ اُن کے ماتحت ہونا ہے جنہیں حریت (freedom) عطا کی گئی تھی، ارادہ اور اختیار کا مالک بنایا گیا تھا۔** اُس دن کسی کو بھی حریت (freedom) حاصل نہیں ہو گی کہ جو چاہا سو کہہ دیا۔اللہ تعالیٰ نے ہمارے بیان کرنے کے لئے یہ دو مرکبات ۔ مَٰلِكِ يَوْمِ ٱلدِّينِ ترتیب دے کر عنایت فرمائے۔اس حقیقت کو قرءان مجید میں انتہائی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے:

وَهُوَ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ بِٱلْحَقِّ ۖ

اور وہی جناب ہیں جنہوں نے آسمانوں اور زمین کو متعین مقصد، متعین سائنسی اصولوں اور متعین مدت کے تحت تخلیق کیا ہے۔

وَيَوْمَ يَقُولُ كُن فَيَكُونُ ۚ

اور جس دن وہ کہیں گے ''وقوع پذیر ہو جا'' تو تعمیل حکم میں وہ واقعہ وقوع پذیر ہو جائے گا۔

قَوْلُهُ ٱلْحَقُّ ۚ

ان جناب کا قول ناقابل تردید حقیقت ہے۔

وَلَهُ ٱلْمُلْكُ يَوْمَ يُنفَخُ فِى ٱلصُّورِ ۚ

اور اُس دن مقتدر و منصف ہونا اُن کیلئے مخصوص ہے جب صور میں پھونک دیا جائے گا۔

عَـٰلِمُ ٱلْغَيْبِ وَ ٱلشَّهَـٰدَةِ ۚ

وہ تمام جو دوسروں کی بصارتوں اور بصیرت سے پنہاں اور اوجھل ہے اور جو کچھ ظاہر اور قابل ادراک ہے ان کو ہر لحہ مکمل طور پر جاننے والے ہیں۔

وَهُوَ ٱلْحَكِيمُ ٱلْخَبِيرُ ﴿٧٣﴾

اور وہ جناب بدرجہ اتم انصاف پسند تمام موجود کائنات کے فرمانروا، سلطنت کے ذرے ذرے سے ہر لحہ باخبر ہیں۔(الانعام۔۷۳)

---

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ ٱلشَّفَـٰعَةُ

جس دن حیات نو کا ظہور ہو چکا ہو گا تو سفارش کسی شخص کو فائدہ نہیں پہنچائے گی۔

إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ ٱلرَّحْمَـٰنُ

اس بیان سے استثناء اُن (ﷺ) کے لئے ہے جن کیلئے الرّحمن (ذالجلال والاکرام) نے اجازت دی ہوئی ہے۔

وَرَضِىَ لَهُۥ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾

اور االرّحمن (ذالجلال والاکرام) اُن کیلئے رضا و رغبت کا قول قبولیت دے چکے ہیں۔(سورۃ طہ۔۱۰۹)

---

ٱلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۚ

اقتدار مطلق اللہ تعالیٰ کے لئے مختص ہو گا جس دن حیات نو دیئے جانے پر لوگوں کو مجتمع کر دیا گیا ہو گا۔ وہ جناب ان کے مابین فیصلہ فرما دیں گے۔

فَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّـٰلِحَـٰتِ

قرءان مجید پہنچ جانے اور متنبہ کر دیئے جانے پر جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو رسول کریم اور قرءان مجید پر ایمان لائے اور انہوں نے صالح اعمال کئے۔

فِى جَنَّـٰتِ ٱلنَّعِيمِ ﴿٥٦﴾

ان کی حیات آخر میں پُر مسرت و تعیش باغات میں رہائش کا انتظام ہے۔(الحج۔۵۶)

---

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَٰكُمْ عَبَثًا

کیااس دن کے متعلق لاپرواہی اس وجہ سے تھی کہ تم لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ہم جناب نے تم لوگوں کو یونہی بے مقصد تخلیق کیا تھا۔

وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ﴿١١٥﴾

اور یہ کہ تم لوگوں کو ہمارے حضور احتساب کے لئے پیش نہیں کیا جائے گا۔(المومنون۔۱۱۵)

---

ٱلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ ٱلْحَقُّ لِلرَّحْمَٰنِ

مبنی بر حقیقت اقتدار الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) کے لئے مختص اور شایان شان ہے جس دن حیاتِ نو دیئے جانے پر لوگوں کو مجتمع کر دیا گیا ہو گا۔

وَكَانَ يَوْمًا عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ عَسِيرًا ﴿٢٦﴾

متنبہ رہو؛ وہ دن ایسا ہے کہ مرتے دم تک ہٹ دھرمی سے انکار کرنے والوں پر کٹھن ہو گا۔(الفرقان۔۲۶)

---

يَوْمَ هُم بَٰرِزُونَ ۖ

یہ دن وہ ہے جب وہ سامنے نکل آئیں گے۔

لَا يَخْفَىٰ عَلَى ٱللَّهِ مِنْهُمْ شَىْءٌ ۚ

اُن کی کوئی بات حسب معمول اللہ تعالیٰ سے چھپی نہ ہو گی۔

لِّمَنِ ٱلْمُلْكُ ٱلْيَوْمَ ۖ

(پوچھا جائے گا)''آج بادشاہت، مقتدر و منصف ہونا کس کیلئے ہے''۔

لِلَّهِ ٱلْوَٰحِدِ ٱلْقَهَّارِ ﴿١٦﴾

(جواب دیں گے)''اللہ تعالیٰ کیلئے مختص ہے، قوت و غلبہ کے واحد مالک کیلئے''۔(غافر۔۱۶)

الحمدللہ ہم اس بات کا اعتراف اور برملا اعلان آج بھی کرتے ہیں۔

**يَوْمِ ٱلدِّينِ۔ جزا و سزا دیئے جانے کا دن**

یہ آیت مبارکہ ۔۴ میں دوسرا مرکب اضافی ہے جو آیت ۔۲ کے جملے کا حصہ ہیں۔

قرءانِ مجید میں مجرور حالت میں یہ مرکب اضافی تین بار ہے: Recurrence:(1)01:04(2)15:35(3)38:78=3

مضاف کے اعراب کے فرق کے ساتھ منصوب حالت میں بھی تین بار ہے۔يَوْمَ ٱلدِّينِ۔:82:15(3),56:56(2)26:82(1)

مرفوع حالت میں چار بار ہے. يَوْمُ ٱلدِّينِ: 4=82:18(4)82:17(3)51:12(2)37:20(1)

اور ابتداء میں حرف جر کے ساتھ بھی تین بار ہے بِيَوْمِ ٱلدِّينِ: 83:11(3)74:46(2),70:26(1)

مضاف الیہ: ٱلدِّينِ معرفہ باللام ہے۔اس مقام پر حرف کی قسم ''الْعَهْدُ الذِّهْنِيُّ'' ہے کیونکہ اس سے پہلے یہ بیان نہیں ہوا۔اس قسم کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہمارے تصور اور علم میں پہلے سے ہے، قرءان مجید میں بیان کے حوالے سے۔اس کے معنی ''متعین/کہنے اور سننے والے دونوں کے تصور میں جانا پہچانا دن'' ہے۔ہم جب خود اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اُس دن کو نہ صرف جانتے اور پہچانتے ہیں بلکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اُس دن کی خصوصیت اور اُس میں پنہاں واقعات کیا ہیں۔دوسری مرتبہ یہ مرکب اضافی مجرور حالت میں انسان کی تاریخ کے اولین دور کے قصے میں بیان ہوا ہے جب وہ اس کائنات سے باہر کی دنیا میں وجود پذیر ہوا تھا۔اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ تعظیم بجالانے کے حکم کی عدم تعمیل پر ابلیس کو حکم دیا تھا:

قَالَ فَٱخۡرُجۡ مِنۡهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٞ ٣٤

انہوں نے کہا''عدم تعمیلِ حکم اور اپنے تئیں آدم سے بہتر سمجھنے کے سبب تجھے حکم دیا جاتا ہے کہ یہاں سے نکل جا۔اس کے بعد تو رجیم/مردود، دھتکارا، دور کیا ہوا رہے گا۔

وَإِنَّ عَلَيۡكَ ٱللَّعۡنَةَ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلدِّينِ ٣٥

اور یقیناً یوم الدین۔ جزاو سزا کے دن تک تجھ پر دھتکار ہے۔''(الحجر۔۳۵)

---

قَالَ فَٱخۡرُجۡ مِنۡهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٞ ٧٧

انہوں نے کہا''عدم تعمیلِ حکم اور اپنے تئیں آدم سے بہتر سمجھنے کے سبب تجھے حکم دیا جاتا ہے کہ یہاں سے نکل جا۔اس کے بعد تو رجیم/مردود، دھتکارا، دور کیا ہوا رہے گا۔

وَإِنَّ عَلَيۡكَ لَعۡنَتِيٓ إِلَىٰ يَوۡمِ ٱلدِّينِ ٧٨

اور یقیناً یوم الدین۔ جزاو سزا کے دن تک تجھ پر میری جانب سے دھتکار ہے۔''(سورۃ ص۔۷۸)

اور یوں ابلیس رجیم قرار پایا اور ملعون ہوا۔اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرنے کی بجائے ابلیس نے یہ اپیل/مطالبہ کر دیا:

قَالَ أَنظِرۡنِيٓ إِلَىٰ يَوۡمِ يُبۡعَثُونَ ١٤

اس(ابلیس) نے التجا کرتے ہوئے کہا"اس لئے آپ جناب مجھے حیات نو دیئے جانے کے دن تک مہلت عنایت فرمائیں"۔

قَالَ إِنَّكَ مِنَ ٱلۡمُنظَرِينَ ١٥

اللہ تعالیٰ نے کہا''چونکہ تیری التجا قبول کر لی گئی ہے، اس لئے یقیناً مہلت دیئے جانے والوں میں تو سب سے اول ہے"۔(الاعراف۔۱۵)

ابلیس کی مہلت مانگنے والی بات سورۃ الحجر کی آیت 36 اور سورۃ ص کی آیت 79 میں من و عن ایک جیسے الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے:

قَالَ رَبِّ فَأَنظِرۡنِيٓ إِلَىٰ يَوۡمِ يُبۡعَثُونَ ٣٦

اس(ابلیس) نے التجا کرتے ہوئے کہا"میرے رب! آپ نے چونکہ مجھے اس بشر کی وجہ سے ملعون کر دیا ہے اس لئے آپ جناب مجھے حیات نو دیئے جانے کے دن تک مہلت عنایت فرمائیں"۔(الحجر۔۳۶)

اللہ تعالیٰ کا ابلیس کو جواب سورۃ الحجر کی آیت ۳۷۔۳۸ اور سورۃ ص کی آیت ۸۰۔۸۱ میں من و عن ایک جیسے الفاظ میں یہ بیان ہوا ہے:

قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ ٱلۡمُنظَرِينَ ٣٧

اللہ تعالیٰ نے کہا"چونکہ تیری التجا قبول کرلی گئی ہے،اس لئے یقیناً مہلت دیئے جانے والوں میں تو سب سے اول ہے،

إِلَىٰ يَوْمِ ٱلْوَقْتِ ٱلْمَعْلُومِ ﴿٣٨﴾

ایک طے شدہ وقت پر ظہور پذیر ہونے والے مخصوص دن تک۔"(الحجر۔۳۸)

ابلیس کو بھی معلوم ہے کہ ٱلدِّينِ۔ فعل "دَانَ، يَدِينُ" کا مصدر ہے۔اور احتساب جبھی ہوتا ہے جب حالت حیات میں ہو۔اُس نے بنی آدم کی اکثریت کے انجام پر اثرانداز ہونے اور اسے برباد کرنے کیلئے یوم بعث تک کیلئے مہلت کی درخواست/رٹ دائر کردی جو منظور کرلی گئی۔یوم الدین یوم بعث ہے۔یہ وہ دن ہے جب تمام لوگوں کو احتساب کیلئے اٹھایا(بعث) جانا ہے۔اِس کا مادہ "ب ع ث" اور اِس کے بنیادی معنی اُس چیز کو راستہ سے ہٹادینا ہیں جو کسی کی آزادانہ نقل و حرکت میں حائل ہو،اُس قسم کے موانع کو دور کرکے اُس کی حرکت کو جاری کردینا۔اُس چیز کو جس کی بناءپر "موت" واقع ہوئی تھی اگر راہ سے ہٹادیا جائے تو زندگی پھر سے رواں دواں ہو جائے گی۔

اگر ابلیس کو۔يَوْمِ ٱلدِّينِ۔کے معنی اور مفہوم،دن کی جان اور پہچان ہے اور اُس کی اہمیت اور نوعیت کا بھی احساس ہے تو کیا انسان اُس دن کے متعلق لاعلم ہے؟ کیا انسان اُس دن کو نہیں جانتا اور پہچانتا؟ کیا اُس کیلئے معرفہ نہیں؟ ذی ہوش جانتے ہیں:

فَإِنَّمَا هِىَ زَجْرَةٌ وَٰحِدَةٌ

چونکہ حیاتِ نو کے ظہور کا نظام تخلیق کا حزو ہے اس لئے وہ(نفخِ بعثت) الصور میں دوسری/آخری پھونک تو صرف ایک ہی زوردار آواز ہو گی

فَإِذَا هُمْ يَنظُرُونَ ﴿١٩﴾

جس کے نتیجے میں اس وقت وہ لوگ یکایک کھڑے ہو کر منتظر ہوں گے (کہ آگے کیا پیش آتا ہے)۔(الصافات۔۱۹)

وَقَالُوا۟ يَٰوَيْلَنَا هَٰذَا يَوْمُ ٱلدِّينِ ﴿٢٠﴾

اور انہوں نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا"ہائے ہماری شومئِ قسمت! یہ یوم الدین ہے"۔(الصافات۔۲۰)

انسان کسی دوسرے کے بتائے اور کہے بغیر جب کسی بات کو اعلانیہ بیان کرتا ہے تو یہ ثبوت ہے اِس بات کا کہ اعلان کردہ بات اُس کی یاداشت میں پہلے سے محفوظ ہے،اور اِس انداز میں محفوظ ہے کہ اُس کے متعلق جانکاری اور پہچان رکھی ہے۔**یوم قیامت کو اُن کا یہ بیان اِس بات کا ثبوت ہے کہ یہ دن اُن کیلئے زمین پر دوران حیات جانے پہچانے معنی اور مفہوم کا حامل تھا۔**ملائکہ نے اُن لوگوں کی اعلانیہ گفتگو پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن سے کہا:

هَٰذَا يَوْمُ ٱلْفَصْلِ

انہیں ملائکہ نے کہا"ہاں! یہ فیصلے،الگ الگ کردیئے جانے کا دن ہے۔

ٱلَّذِى كُنتُم بِهِۦ تُكَذِّبُونَ ﴿٢١﴾ 37:21

یہ وہی دن ہے جسے تم لوگ مسلسل سرعام جھٹلاتے رہتے تھے"۔(الصافات۔۲۱)

یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے قبروں سے اٹھتے ہی اُس دن کو۔يَوْمُ ٱلدِّينِ قرار دیا ہے؟

یہ وہ لوگ ہیں جو آج ازراہ مزاح یہ پوچھتے ہیں کہ اُس دن کی تاریخ کون سی ہے۔

يَسْـَٔلُونَ أَيَّانَ يَوْمُ ٱلدِّينِ ﴿١٢﴾

وہ(فریب زدہ/فریب کار) پوچھتے رہتے ہیں "احتساب اور جزاو سزا فیصلے کا دن مستقبل کی کس تاریخ کو ٹھہرایا گیا ہے؟" (الذاریات۔۱۲)

قابلِ اہمیت نکتہ یہ ہے کہ آخرت ہے لیکن ایسے لوگ جنہیں تذبذب ہے، اُس دن کی جنہیں پرواہ نہیں، جنہیں احتساب کا یقین نہیں، اور جو اُس کو اعلانیہ جھٹلاتے ہیں، ایسے لوگ اُس دن کا زمان اور تاریخ جاننے میں دلچسپی رکھتے اور کریدتے رہتے ہیں۔

يَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلسَّاعَةِ أَيَّانَ مُرۡسَىٰهَاۖ

آپ(ﷺ) سے وہ اُس مخصوص ساعت کے متعلق پوچھتے رہتے ہیں کہ آپ بتائیں مستقبل میں اُس کے لنگر انداز/وقوع پذیر ہونے کا مقررہ وقت کیا ہے؟

اور آقائے نامدار ﷺ سے فرمایا:

قُلۡ إِنَّمَا عِلۡمُهَا عِندَ رَبِّىۖ

آپ(ﷺ) جواب دیں، "حقیقت تو یہ ہے کہ میرے پاس اس کا جواب نہیں کیونکہ اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے۔

لَا يُجَلِّيهَا لِوَقۡتِهَآ إِلَّا هُوَۚ

سوائے اُن جناب کے کوئی نہیں ظاہر کر سکتا کہ وقت کے کس مقام پر وہ لمحہ ہے۔

ثَقُلَتۡ فِى ٱلسَّمَـٰوَٲتِ وَٱلۡأَرۡضِۚ

تاہم میں صرف یہ تم لوگوں پر واضح کر سکتا ہوں کہ وہ ساعت آسمانوں اور زمین میں بھاری ہو گی۔

لَا تَأۡتِيكُمۡ إِلَّا بَغۡتَةًۗ

وہ تم لوگوں پر بالکل اچانک آن پہنچے گی۔"

اور پھر اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ سے ان کے رویئے پر اظہار تعجب کرتے ہوئے وہی جواب لوگوں کو دہرانے کے لئے کہا:

يَسۡـَٔلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِىٌّ عَنۡهَاۖ

تعجب ہے آپ(ﷺ) سے وہ لوگ تو یوں اُس کے متعلق پوچھتے ہیں جیسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ صرف اِس بات کی تحقیق میں لگے ہوں۔

قُلۡ إِنَّمَا عِلۡمُهَا عِندَ ٱللَّهِ

آپ(ﷺ) ارشاد فرمائیں "حقیقت یہ ہے کہ اُس لمحے کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔"

وَلَـٰكِنَّ أَكۡثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعۡلَمُونَ ١٨٧

اس قدر دوٹوک جواب کے باوجود اکثر لوگ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔(الاعراف۔۱۸۷)

دوسرے مقام پر مزید بتایا:

يَسۡـَٔلُكَ ٱلنَّاسُ عَنِ ٱلسَّاعَةِۖ

آپ(ﷺ)سے وہ اُس مخصوص ساعت کے متعلق پوچھتے رہتے ہیں۔

قُلۡ إِنَّمَا عِلۡمُهَا عِندَ ٱللَّهِۚ

آپ(ﷺ)جواب دیں،''حقیقت تو یہ ہے کہ میرے پاس اس کا جواب نہیں کیونکہ اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے''۔

اور زمانے کے حوالے سے بھی قیاس آرائیوں کا راستہ بند کر دیا۔ فرمایا

وَمَا يُدۡرِيكَ لَعَلَّ ٱلسَّاعَةَ تَكُونُ قَرِيبٗا ٦٣

اور وہ کون سے اشارہ اور نشان ہے جو آپ(ﷺ)کو اُس لمحے کا ادراک دے سکے کہ ممکن ہے وہ ساعت بالکل قریب پہنچ چکی ہو۔(الاحزاب۔٦٣)

---

ٱللَّهُ ٱلَّذِيٓ أَنزَلَ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ

اللہ تعالیٰ وہ جناب ہیں جنہوں نے منفرد کتاب(قرءان عظیم)کو مجتمع انداز میں نازل فرمایا ہے؛ مبنی بر حقیقت اور زمان کی مناسبت سے۔

وَٱلۡمِيزَانَۗ

اور عدل وانصاف اور جھوٹ وسچ کو جانچنے کا معیار نازل کیا ہے۔[لوگوں کے مابین انصاف اور مساوات کے تقاضوں کے مطابق جانچ کا معیار۔الحدید۔٢٥]

وَمَا يُدۡرِيكَ لَعَلَّ ٱلسَّاعَةَ قَرِيبٞ ١٧

اور اس کتاب سے ماوراء وہ کون سے اشارہ اور نشان ہے جو آپ(ﷺ)کو اُس لمحے کا ادراک دے سکے کہ ممکن ہے آخری ساعت بالکل قریب پہنچ چکی ہے۔(الشوریٰ۔١٧)

اللہ تعالیٰ نے آقائے نامدار ﷺ سے ادراک کے متعلق یہ بات دو بار ارشاد فرمائی اور اُن ﷺ سے قرءانِ مجید میں دو مرتبہ لوگوں کو کہلوایا:

فَإِن تَوَلَّوۡاْ فَقُلۡ ءَاذَنتُكُمۡ عَلَىٰ سَوَآءٖۖ

بات کو سن کر اگر وہ لوگ اقرار کئے بغیر منہ موڑ کر چل دیں تو آپ(ﷺ)انہیں سنا دیں''میں نے تم لوگوں کو برابری/یکسانیت کے اصول پر اطلاع کر دی ہے۔

وَإِنۡ أَدۡرِيٓ أَقَرِيبٌ أَم بَعِيدٞ مَّا تُوعَدُونَ ١٠٩

اور جہاں تک تمہارے اُس لمحے/دن کے متعلق سوال کا تعلق ہے تو مجھے اِس بات کا اِدراک نہیں کہ جس دن کا تم لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے آیا وہ مستقبل قریب میں ہے یا مستقبل بعید میں۔(الانبیاء۔١٠٩)

---

قُلۡ إِنۡ أَدۡرِيٓ أَقَرِيبٞ مَّا تُوعَدُونَ

آپ(ﷺ)لوگوں کو کہہ دیں''مجھے اِس بات کا ادراک نہیں کہ جس کا تم لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے آیا مستقبل قریب کیلئے ہے۔

أَمۡ يَجۡعَلُ لَهُۥ رَبِّيٓ أَمَدًا ٢٥

یا اس وعدے کی تکمیل کے لئے میرے رب دور کی مدت میں تاریخ کو قرار دیتے ہیں۔(الجن۔٢٥)

آقائے نامدار ﷺ نے یہ بات لوگوں سے کہی تھی اور اُن کے اپنے الفاظ میں یہ بات/حدیث اللہ، قول رسول بن کر ہم تک پہنچی ہے۔ آپ ﷺ نے حتمی تاریخ اور نشانی تو کیا اُن لوگوں اور ہمارے لئے روز قیامت کیلئے قریب اور دور کے حوالے سے بھی مدت کا تعین نہیں فرمایا۔ **کسی بھی بات، شئے، مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کا ادراک کرنے کیلئے سبب اور وجہ کوئی دوسری بات، اشارہ، نشانی بنتی ہے۔** اگر دوسری نشانی اور اشارہ کوئی نہیں، تو ہم کسی بھی بات کا ادراک نہیں کر سکتے۔ **اللہ تعالیٰ اور رسولِ کریم ﷺ نے واضح فرما دیا ہے کہ رسولِ کریم ﷺ اور انسانوں کیلئے اُس دن کیلئے کوئی نشانی نہیں جو انہیں اُس مخصوص دن کے متعلق ادراک دے سکے۔**

وَمَآ أَدۡرَىٰكَ مَا يَوۡمُ ٱلدِّينِ ١٧

اور وہ کون سا اشارہ ہے جو آپ (ﷺ) کو اس بات کا ادراک/جانکاری دے سکے کہ جزا و سزا کا دن/یوم الدین کون سا ہے۔

ثُمَّ مَآ أَدۡرَىٰكَ مَا يَوۡمُ ٱلدِّينِ ١٨

بعد ازاں سوچ بچار کر لینے پر بھی وہ کون سا اشارہ ہے جو آپ (ﷺ) کو اس بات کا ادراک/جانکاری دے سکے کہ جزا و سزا کا دن/یوم الدین کون سا ہے۔

يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٞ لِّنَفۡسٖ شَيۡـٔٗاۖ

آپ (ﷺ) اِتنا بتا دیں؛ ''اُس دن کوئی شخص کسی دوسرے شخص کیلئے کچھ اختیار نہیں رکھے گا۔

وَٱلۡأَمۡرُ يَوۡمَئِذٖ لِّلَّهِ ١٩

اور یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ جب یہ دن وقوع ہو گا تو معاملے کا فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے مختص ہے''۔ (الانفطار۔۱۹)

ہم نے یوم قیامت کے مناظر میں یہ دیکھا اور سن لیا ہے کہ تمام کو۔ يَوۡمِ ٱلدِّينِ۔ کے معنی اور مفہوم معلوم ہیں۔ حقیقت کو دانستہ سرِ عام لوگوں میں جھٹلانے والے یہ جھوٹے جہنم میں پہنچنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لوگوں سے خود اعتراف کریں گے۔

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوۡمِ ٱلدِّينِ ٤٦

اور ہم جزا اور سزا دیئے جانے کے دن کو سرِ عام دانستہ جھٹلاتے رہتے تھے۔

حَتَّىٰٓ أَتَىٰنَا ٱلۡيَقِينُ ٤٧

ہم نے اسی عادت کو اپنائے رکھا یہاں تک کہ موت نے ہمیں آن لیا''۔ (المدثر۔۴۷)

اِن لوگوں کے آج کے رویئے اور انجام کے متعلق لگی لپٹی رکھے بغیر آسان فہم انداز میں بتایا جا رہا ہے:

وَيۡلٞ يَوۡمَئِذٖ لِّلۡمُكَذِّبِينَ ١٠

افسوس، کڑھن، شومئ قسمت کا واویلہ دانستہ تکذیب کے مرتکب افراد کا معمول ہو گا جس دن وہ حیاتِ نو دیئے جانے پر اکٹھے ہو چکے ہوں گے۔

ٱلَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بِيَوۡمِ ٱلدِّينِ ١١

وہ جو جزا و سزا کے دن (یوم الدین) کو برملا جھٹلاتے رہتے ہیں۔ (المطففین۔۱۱)

وَمَا يُكَذِّبُ بِهِۦٓ إِلَّا كُلُّ مُعۡتَدٍ أَثِيمٍ ١٢

اوراسے جھٹلانے کیلئے کوئی بھی سرعام جھوٹ نہیں بولتا سوائے ہر ایک ایک حد سے نکلنے والے گنہگار/سفر کو بوجھل کرنے والے کے۔

إِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِ ءَايَٰتُنَا قَالَ أَسَٰطِيرُ ٱلۡأَوَّلِينَ ١٣

ہماری آیتیں جب اُس کو سنائی گئیں تو اُس نے کہا "یہ اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں"۔

كَلَّاۖ بَلۡۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُواْ يَكۡسِبُونَ ١٤

نہیں! (یہ کہانیاں نہیں ہیں)؛ درحقیقت وہ جو یہ لوگ کماتے رہے ہیں اس نے ان کے دلوں پر زنگ کی تہہ چڑھادی ہے۔(اب سمجھ داخل نہیں ہوتی)۔(المطففین۔۱۴)

ہم خوش نصیب ہیں جنہوں نے الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام کو۔مَٰلِكِ يَوۡمِ ٱلدِّينِ۔قرار دے کر اپنے آپ کو ان لوگوں کی صف میں شامل کرنے کی سعی کی ہے:

وَٱلَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوۡمِ ٱلدِّينِ ٢٦

اور وہ لوگ جو جزاوسزا کے دن (یوم الدین) کو حقیقت سمجھتے ہوئے اُس کی سرعام تصدیق کرتے رہتے ہیں۔(المعارج۔۲۶)

اور آئیں ہم اُن میں نہ ہوں جنہیں اُس دن کی نشانیوں کی کھوج ہے بلکہ اپنے عظیم المرتبت اباحضور، ابراہیم علیہ السلام کی اتباع میں ہم بھی کہیں:

وَٱلَّذِيٓ أَطۡمَعُ أَن يَغۡفِرَ لِي خَطِيٓـَٔتِي يَوۡمَ ٱلدِّينِ ٨٢

"اور وہ جناب ہیں جن سے میں آرزو کرتا ہوں کہ جزاوسزا کے دن (یوم الدین) میرے لئے میری خطائیں بخش دیں گے"۔(الشعراء۔۸۲)

وَلَا تُخۡزِنِي يَوۡمَ يُبۡعَثُونَ ٨٧

"اور میرے رب! مجھے اُس دن ازراہ کرم رسوانہ کریں جب لوگ اٹھائیں جائیں گے"۔(الشعراء۔۸۷)

دانا وبینا لوگوں کی طرح جو تفکر کرتے ہیں اور جانتے ہیں کائنات بلا مقصد نہیں بنائی گئی ہم بھی رب العزت سے دعا کریں:

رَبَّنَآ إِنَّكَ مَن تُدۡخِلِ ٱلنَّارَ فَقَدۡ أَخۡزَيۡتَهُۥۖ

ہمارے رب! یہ حقیقت ہے آپ جناب نے جس کو دوزخ میں داخل کردیا تو یقیناً اسے آپ نے رسوائی میں دھکیل دیا۔

وَمَا لِلظَّٰلِمِينَ مِنۡ أَنصَارٖ ١٩٢

اور کوئی بھی جو مددگار ہو سکتا ہے ایسے لوگوں کے لئے مدد کی حامی نہیں بھرے گا جو حقیقت کے منافی باتوں سے بگاڑ پیدا کرنے والے ہیں"۔(ءالِ عمران۔۱۹۲)

---

رَبَّنَا وَءَاتِنَا مَا وَعَدتَّنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ

ہمارے رب! ہمیں وہ دیں جس کا آپ نے اپنے رسولوں کے ذریعے ہم سے وعدہ کیا ہے۔

وَلَا تُخۡزِنَا يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِۗ

اور روز قیامت کو ازراہ کرم ہمیں رسوانہ کریں۔

إِنَّكَ لَا تُخۡلِفُ ٱلۡمِيعَادَ ١٩٤

یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ وعدے کے خلاف کبھی نہیں کرتے''۔(ءالِ عمران۔۱۹۴)

اللہ تعالیٰ سے ابراہیم علیہ السلام اور داناوبینا لوگوں کے انداز میں ہم نے ان کے وعدے کی یاددہانی کراتے ہوئے مانگ تو بہت کچھ لیا ہے لیکن یہ جاننا بھی تو ضروری ہے کہ اُس دن بعض لوگوں کو سب سے بڑی رسوائی ملے گی کیوں؟ تاکہ پہلے اس سے بچنے کی ترکیب کریں پھر تمنا کریں۔مانگنے میں بھی غیرت اور حیا کے تقاضے پیش نظر رہنے چاہئیں۔

أَلَمۡ يَعۡلَمُوٓاْ أَنَّهُۥ مَن يُحَادِدِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ فَأَنَّ لَهُۥ نَارَ جَهَنَّمَ خَٰلِدٗا فِيهَاۚ

کیاانہوں(منافقین)نے اس بات کاادراک نہیں کیاکہ جو کوئی اللہ تعالیٰ اوران کے رسول(ﷺ)کے پیغام میں رکاوٹیں ڈالتا ہے تواس کے نتیجے میں جہنم میں جھلسنااس کے لئے مستوجب ہو جاتاہے۔وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔

ذَٰلِكَ ٱلۡخِزۡيُ ٱلۡعَظِيمُ ٦٣

یہ سب سے بڑی رسوائی ہے جوان کا پوراڈھانچہ محسوس کرے گا۔

## تَوۡبَةٗ نَّصُوحًا

ہم ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جن تک قرءانِ مجید پہنچا(وَمَنۡ بَلَغَ۔الانعام۔۱۹)ہے۔**اس لئے ہمارے دور میں اللہ تعالیٰ اور رسولِ کریم ﷺ کی مخالفت کا بس ایک انداز ہو سکتا ہے،اللہ تعالیٰ کی ''حدیث،کلام''اور قول رسول کریم ﷺ یعنی قرءانِ مجید کے بیانِ حقیقت کے خلاف بات کو ماننا اور اس کی اتباع** کرتا۔اللہ تعالیٰ کے وعدے کے حوالے سے ہم نے رسوائی سے بچانے کیلئے کہا ہے۔لیکن وعدے سے قبل انہوں نے آج کچھ کرنے کیلئے ہمیں بھی کہا ہے۔آئیں ہم پہلے وہ کر لیں:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ

اے وہ لوگوں جنہوں نے رسول کریم(محمّد ﷺ)اور قرءان مجید پر ایمان لانے کا اقرار واعلان کیا ہے توجہ سے سنو!

تُوبُوٓاْ إِلَى ٱللَّهِ تَوۡبَةٗ نَّصُوحًا

اللہ تعالیٰ کی جانب فہم وفراست کو بروئے کار لاتے ہوئے جذبات کے زیر اثر کئے طرز عمل پر احساس ندامت سے پلٹ آؤ۔مکمل اصلاح کی سوچ اور نیت سے پلٹنے کا انداز ہو۔

عَسَىٰ رَبُّكُمۡ أَن يُكَفِّرَ عَنكُمۡ سَيِّـَٔاتِكُمۡ

تم لوگوں کے رب کی جانب سے قوی امکان ہے کہ جلد وہ جناب تمہاری لغزشوں،برائیوں اور کوتاہیوں کو تمہارے اعمال نامے سے مکمل محو کر دیں۔

وَيُدۡخِلَكُمۡ جَنَّٰتٖ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ

اور وہ جناب تم لوگوں کو ان باغات میں داخل فرمادیں جن کے پائیں نہریں بہتی ہیں۔

يَوۡمَ لَا يُخۡزِي ٱللَّهُ ٱلنَّبِيَّ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَهُۥ

اس دن اللہ تعالیٰ اپنے لئے مختص کردہ اور کائنات کے لئے عالی شرف وعظمت قرار پائے اخلاص کے پیکر بندے(محمّد ﷺ)،اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ قرءان مجید پر ایمان لائے،مایوس نہیں فرمائیں گے۔

نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَٰنِهِمْ

رسول کریم دیکھیں گے کہ ان لوگوں سے پھوٹنے والا نور (سفید روشنی) ان کے سامنے اور دائیں جانب چلتے ہوئے ماحول کو منور کر رہا ہے۔

يَقُولُونَ رَبَّنَآ أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَٱغْفِرْ لَنَآ

وہ سراپا التجا ہوں گے "اے ہمارے رب! آپ جناب ہمارے نور بصیرت کو ہمارے لئے بدرجہ اتم فزما دیں، اور ہمارے لئے دائمی فرمانِ معافی جاری فرما دیں۔

إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ٨

یقیناً آپ جناب ہر ایک شئے اور معاملے کو پیمانوں میں مقید کرنے پر ہمیشہ سے قادر ہیں"۔ (التحریم۔۸)

توبہ کے معنی واپس آجانا، پلٹ آنا ہیں (تاج)۔ سفر میں آگے بڑھتے ہوئے اگر شاہراہ کے کسی چوراہے پر ایک طرف مڑ کر کچھ قدم چلنے کے بعد احساس ہو کہ غلط سمت میں قدم اٹھ گئے ہیں، یہ صحیح راستہ نہیں ہے تو پھر صحیح راستے کی طرف چلنے کیلئے اسی مقام پر لوٹ کر آنا ہوگا جہاں سے قدم غلط سمت کو اٹھے تھے۔ منزل کی طرف بڑھنے کیلئے پہلے اسی مقام پر آنا پڑے گا جہاں سے قدم غلط سمت کو اٹھے تھے اور پھر وہاں سے صحیح راستے پر گامزن ہونا پڑے گا۔ یہ توبہ کا مفہوم ہے۔ توبہ توبہ کہنے سے غلطی کا ازالہ نہیں ہوتا۔ **توبہ عملی قدم ہے جس سے غلط کام کا ازالہ کیا جاتا ہے۔ غلط کام کے مضر اثرات کی تلافی کرتا ہے۔ اپنی غلطی کا احساس کر کے غلط روش کو چھوڑ دینا اور صحیح راستہ، روش، رویئے کو اپنا لینے کا نام توبہ ہے۔ ان تین مراحل کی تکمیل کا نام توبہ ہے۔** ایسا کرنے والے کو تائب کہتے ہیں (تاج)۔ غلطی کے احساس کے بعد اصلاح اور صحیح روش کو اپنانا توبہ کا لازمی جزو ہے۔

**یہ بنیادی طور پر فکری سرگرمی ہے۔ دانش سے متعلق ہے۔ اس میں جذبوں کی بجائے سوچ اور استدلال کی جانب عقل و فکر کا راغب ہونا ہے۔** یہ ذہن کو جذبات کے دائرے سے پیشانی کے پیچھے والے دماغ میں حقیقت اور روشن خیالی کے دائرے میں موڑنا ہے۔ یہ ذہنی تبدیلی احساسِ جرم و غفلت اور پچھتاوے کے حقیقی احساس کا سبب بنتا ہے کیونکہ ماضی میں جسے انتخاب کیا تھا اسے اب غلطی یا غلط سمجھتا ہے اور استثناء اور بریّت حاصل کرنے کی امید اور خواہش رکھتا ہے۔

إِنَّمَا ٱلتَّوْبَةُ عَلَى ٱللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ ٱلسُّوٓءَ بِجَهَٰلَةٍ

اصول یاد رکھنا: اللہ تعالیٰ پر توبہ کی قبولیت کا حق اُن صرف لوگوں کے لئے یقینا ہے جو برا عمل اچانک جذبات سے مغلوب اور اس کی رو میں بہہ جانے کی وجہ سے کر گزرتے ہیں۔

ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُوْلَٰٓئِكَ يَتُوبُ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ

بعد ازاں وہ قریب وقت میں ندامت سے اپنی اصلاح کی جانب پلٹ لیتے ہیں۔ ان کے اس از خود اصلاح کے جذبے کی قدر فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ درگزر اور نظر عنایت سے متوجہ ہو جاتے ہیں۔

وَكَانَ ٱللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ١٧

اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ حقیقت ہے کہ منبع علم ہیں، تمام نظام کے بدرجہ اتم انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والے فرمانروا ہیں۔ (النساء۔۱۷)

---

وَإِذَا جَآءَكَ ٱلَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِـَٔايَـٰتِنَا

اور جب آپ (ﷺ) کے پاس وہ لوگ ملاقات کے لئے آئیں جو ہم جناب کی (قرءان مجید میں درج) آیات کو صدق دل سے تسلیم کرتے ہیں:

فَقُلْ سَلَٰمٌ عَلَيْكُمْ

تو رسمی علیک سلیک کے بعد آپ (ﷺ) انہیں بشارت دیں "تم پر سلامتی کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ ہے۔

صلے

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ ٱلرَّحْمَةَ

تم لوگوں کے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے آپ پر لازم کر لیا تھا۔

أَنَّهُۥ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوٓءًۢا بِجَهَـٰلَةٍ

وہ رحم و کرم یہ ہے کہ تم میں سے جس کسی نے جذبات کی شورش سے مغلوب حالت میں برائی کے عمل کا ارتکاب کر لیا۔

ثُمَّ تَابَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَصْلَحَ

بعد ازاں اس عمل کا مرتکب ہو جانے کے بعد اس نے ندامت کے احساس سے معافی کے لئے خواستگار ہوا اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لی۔

فَأَنَّهُۥ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥٤﴾

تو وہ جناب اس کی توبہ قبول کرتے ہیں کہ وہ جناب اکثر و بیشتر در گزر اور پردہ پوشی کرنے اور معاف فرمانے والے ہیں، منبع رحمت ہیں۔(الانعام۔۵۴)

---

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا۟ ٱلسُّوٓءَ بِجَهَـٰلَةٍ

بعد ازاں ایک برے فعل کے مرتکب ہونے کے آپ(ﷺ) کے رب ان لوگوں کو موقع دیتے ہیں جنہوں نے جذبات کی شورش سے مغلوب ہو کر برا عمل کر دیا ہے۔

ثُمَّ تَابُوا۟ مِنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوٓا۟

بعد ازاں، اس عمل کو انجام دینے کے بعد، جذبات کے دائرے سے نکل کو عقل و خرد کی دنیا میں پشیمانی اور ندامت محسوس کرتے ہوئے پلٹ آئے۔اور انہوں نے آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لی۔

إِنَّ رَبَّكَ مِنۢ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١١٩﴾

یہ حقیقت ہے کہ آپ(ﷺ) کے رب ان ذہنی و فکری اور طرز عمل کی تبدیلیوں کے بعد لا محالہ در گزر اور پردہ پوشی کرتے ہوئے معاف فرمانے والے ہیں؛ وہ جناب منبع رحمت ہیں، تمام فیصلے رحمت کی چھاؤں میں فرماتے ہیں۔(النحل۔۱۱۹)

اردو/انگریزی میں انسان کے ہر اس عمل کو جو علم کی ضد میں سرزد ہوتا ہے جہالت، نادانی کہتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں علم کے متضاد عمل کو۔بِجَهَـٰلَةٍ۔سے بیان نہیں کرتے۔قرءانِ مجید علم کے بغیر کئے گئے عمل کو یوں بیان کرتا ہے:

قَدْ خَسِرَ ٱلَّذِينَ قَتَلُوٓا۟ أَوْلَـٰدَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ

یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو انجام میں خسارے میں کر لیا ہے جنہوں نے اپنی اولاد کو قتل کیا، محض توہم پرستی کی خاطر۔یہ کرتے ہوئے علم کے متضاد رویہ اپنایا۔(حوالہ الانعام۔۱۴۰)

کیا برا عمل/فحش جنسی عمل بشمول زنا۔بِجَهَـٰلَةٍ۔اُس اردو والے لفظ ''جہالت'' کے سبب ہوتا ہے جسے ''علم'' کی ضد قرار دیا جاتا ہے؟ نہیں! برا عمل یا تو حالت غفلت میں ہو سکتا ہے یا پھر سینے، شکم اور زیر ناف کی کسی بھوک کو مٹانے کیلئے اور خواہش کی تسکین کے جذبے کے زیر اثر اور اس سے مغلوب ہونے پر وجود پذیر ہوتا ہے۔ برا عمل ایک عالم، دانا و بینا، صاحب علم و بصیرت سے بھی سرزد ہو سکتا ہے اور اس سے بھی جو علم نہیں رکھتا، عقل و فہم کا کمزور ہے، جاہل و گنوار ہے۔توبہ ان لوگوں کیلئے ہے جو کوئی برا فعل و عمل۔بِجَهَـٰلَةٍ۔کر بیٹھتے ہیں پھر توبہ اور اصلاح کر لیتے ہیں۔اگر ''جہالت'' کے معنی علم کی ضد تصور کئے جائیں تو پھر ''اصلاح'' کے معنی علم حاصل کرنا ہو جائیں گے۔

چونکہ۔بِجَهَـٰلَةٍ۔کی بناءپر برا عمل کرنے والے کیلئے شرائط پورا کرنے پر توبہ کی قبولیت کا حق ہے اس لئے اس کے معنی اور مفہوم اس سے بھی واضح ہو جائیں گے کہ کن کے برے عمل کی توبہ نہیں ہے۔

وَلَيْسَتِ ٱلتَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ ٱلسَّيِّـَٔاتِ

مگر متنبہ رہو؛توبہ کی قبولیت کا استحقاق ان لوگوں کے لئے قطعی نہیں ہے جو بدستور قابل تعزیر برائیوں پر عمل پیرا رہتے ہیں

حَتَّىٰٓ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ ٱلْمَوْتُ قَالَ إِنِّى تُبْتُ ٱلْـَٰٔنَ

یہاں تک کہ ان میں سے کسی ایک کے پاس جب یقینی موت کا احساس پہنچ گیا تو اس نے کہا"یقیناً میں نے اسی لمحے اپنے آپ کو برائیوں سے تائب کر لیا ہے"۔

وَلَا ٱلَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ

اور نہ توبہ کی قبولیت کا استحقاق ان لوگوں کے لئے ہے جو طبعی موت مرنے لگے ہیں اس حالت میں کہ اس لمحے تک رسول کریم اور قرءان مجید کا ہٹ دھرمی سے انکار کرنے والے تھے۔

أُو۟لَـٰٓئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

یہ ہیں وہ لوگ۔۔ہم جناب نے ایک دردناک عذاب ان کے جرائم کی ان کو سزا دینے کے لئے تیار کر دیا ہے۔

واضح ہوا کہ برے عمل کو برا سمجھنے اور جاننے کے باوجود ایک شخص سے برے عمل جذبات وخواہش سے مغلوب ہو کر دانستہ اور نادانستہ بھی سرزد ہوتے ہیں۔اور دوسرا شخص موت کا وقت آنے تک دانستہ برے عمل کئے چلا جاتا ہے جبکہ۔بِجَهَـٰلَةٍ جذبات سے مغلوب ہو کر برا عمل کرنے والا جلد ہی توبہ کرتا ہے اور اصلاح کرتا ہے اور اس کیلئے اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہیں(الانعام۔۵۴)۔اور الانعام کی آیت ۵۵ میں بتایا:

وَكَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ ٱلْـَٔايَـٰتِ

اس طرح کے انداز بیان سے ہم جناب آیات کو جدا جدا موضوعات کے فریم میں تالیف فرماتے ہیں۔اس کا بنیادی مقصد لوگوں کے سمجھنے کے لئے آسان فہم بنانا ہے۔

وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ ٱلْمُجْرِمِينَ ﴿٥٥﴾

اور مزید براں ایسا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مجرمین کی راہ/نظریہ اور طریق حیات اپنے آپ سے متمیز اور نمایاں ہو جائے۔(الانعام-۵۵)

جذبات کے زیر اثر غلط کام دو طرح سے وقوع پذیر ہو سکتے ہیں۔پہلی صورت یہ کہ جذبات کی طغیانی میں بہہ کر کوئی غلط کام اچانک سرزد ہو جائے(on the spur of a moment or instinctively)اور دوسری صورت یہ ہے کہ دل کی خواہش اور جذبات کی تسکین کیلئے کسی غلط کام کو سوچ سمجھ کر دانستہ کرنا۔خواہش،آرزو،جذبات کا سبب اور تحریک بننے والے مراکز سینہ،شکم اور زیر ناف ہے۔صالح فعل وعمل عقل وفہم کے تابع ہوتا ہے اور دانستہ یا غیر دانستہ برا فعل وعمل غفلت کی بناءپر یا نفس (جذبات) کے کہنے پر ہوتا ہے جو سینے اور زیر ناف کی کسی خواہش اور بھوک کی تسکین کا ذریعہ بنتا ہے۔سینہ اور زیر ناف انسان کے ارادے اور اختیار کے تابع ہے۔لیکن شکم کی بھوک مکمل طور پر انسان کے ارادے اور اختیار میں نہیں ہے اور حیات کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں اس لئے استثناء دیا گیا ہے۔

فَمَنِ ٱضْطُرَّ فِى مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ ۙ

چونکہ زندگی کو اچانک خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اس لئے اس ممانعت کا اطلاق اس شخص پر نہیں ہوگا جو لاچارگی،بھوک سے نڈھال اضطراری کیفیت میں ہو گیا ہے بشرطیکہ

گناہ پر مائل سوچ میں نہیں ہے۔(حوالہ المائدہ۔۳)

انسان جب۔تَوۡبَةً نَّصُوحًا۔کے مرحلے سے گزر جاتا ہے تو ان کا ہمعصر بن جاتا ہے جنہوں نے یہ پوچھے جانے پر کہا تھا:

وَأَشۡهَدَهُمۡ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمۡ أَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡۖ

اور خود انہیں ان کے نفوس پر عہد کا گواہ بنایا اور ان سے پوچھا "مجھے بتاؤ، کیا تمہارا رب فقط میں نہیں ہوں"۔

قَالُواْ بَلَىٰ شَهِدۡنَآ

انہوں نے جواب دیا "کیوں نہیں، آپ ہمارے مطلق رب ہیں؛ ہم نے اس بات کی گواہی دے دی ہے"۔(حوالہ الاعراف۔۱۷۲)

" نَّصُوحًا۔"کا مادہ "ن ص ح" ہے۔شہد صاف کرنے اور کپڑا سینے کو کہتے ہیں۔شئے خالص ہو گئی۔تَوۡبَةً نَّصُوحًا۔کے معنی ایسی توبہ ہیں جس کے بعد انسان مخلص بندہ بن جائے۔تَوۡبَةً نَّصُوحًا۔کے بعد انسان محض منہ سے نہیں دل کی گہرائیوں سے پورے خلوص سے کہہ اٹھے گا:

إِيَّاكَ نَعۡبُدُ

آپ اور صرف آپ جناب ہیں جن کی بندگی ہم تسلسل سے بااظہار کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے

وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ ٥

اور صرف آپ ہیں جن سے اپنی شخصیت کو اوج ثریا پر لے جانے کیلئے اعانت کے ہم طلبگار ہیں۔(الفاتحہ۔۵)

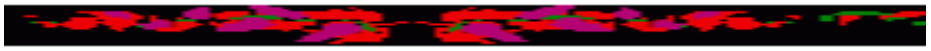



---

۔ترجمہ آیت۔۵

إِيَّاكَ نَعۡبُدُ

آپ اور صرف آپ جناب ہیں جن کی بندگی ہم تسلسل سے بااظہار کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے

وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ ٥

اور صرف آپ ہیں جن سے اپنی شخصیت کو اوج ثریا پر لے جانے کیلئے اعانت کے ہم طلبگار ہیں۔(الفاتحہ۔۵)

آیت مبارکہ کے الفاظ کی صرف و نحو و معنوی تحلیل (ویڈیو)

---

تحلیل۔ تشریح معنوی و مفہوم، بلاغت

إِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ یہ جملہ فعلیہ ہے؛ ایک بار ہے۔ إِيَّا۔ یہ حرف ہے جس میں تخصیص کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ تنہا نہیں آتا بلکہ ضمیر کے ساتھ آتا ہے۔ "كَ"، متصل ضمیر ہے، واحد مذکر مخاطب، اللہ تعالیٰ، الرحمٰن ذالجلال والاکرام۔ مفعول بہ کو تعظیم اور توکید کے لئے مقدم کیا گیا ہے۔ قدرتی (default) ترتیب فعل، فاعل اور مفعول ہے۔ یہ جملہ خبر یہ ہے کہ اس میں ایک دعویٰ موجود ہے۔ متکلم اور مخاطب دونوں جانتے ہیں جو کہا گیا ہے۔ **اس لئے مقصود، بیان کردہ بات کو ایک دائمی وعدہ کی حیثیت دینا ہے اور کسی خواہش کا اظہار کرتے کی راہ ہموار کرتا ہے۔**

نَعْبُدُ: فعل مضارع مرفوع جمع متکلم، متعدی ہے۔ اور مضارع فعل میں حال اور مستقبل دونوں شامل ہوتے ہیں۔ ماخذ "ع ب د"؛ مصدر "عِبَادَةٌ"۔ یہ باب "نَصَرَ۔یَنصُرُ" سے ہے۔ فعل مضارع مرفوع وقت کے حوالے سے کسی خاص لمحات میں محدود نہیں ہوتا۔ یہ ماضی میں شروع کئے فعل پر پائیداری اور دائم کا اظہار کرتا ہے؛ شروع اور نامکمل، ماضی، حال اور مستقبل کو احاطہ میں لیتے ہوئے۔ یہ اُس فعل کی نشاندہی کرتا ہے جو وقت کے خاص لمحے کے حوالے اور دوسرے اوقات میں نہ کئے جانے سے متعلق نہیں ہے۔ دوسرے انداز میں کہیں تو ایسا فعل (انگریزی indefinite present) جس میں وقت کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔

ہم صاحبان ایمان سے بڑا فلسفی کون ہوگا جو اس انداز اور ترتیب میں فلسفہ۔ مابعد الطبیعات (Metaphysics)، "وجود۔the Existence" کو بیان کر سکے۔ کسی بھی **فعل** (توانائی [energy] کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی کام کو اول مرتبہ کرنا) **کے سرزد ہوتے سے قبل صاحب قوت و ارادہ ہستی کا موجود ہونا یہی حقیقت** ہے۔ نہ جانے کیوں بعض فلسفیوں اور سائنس کے ماہرین کو کائنات کے ذرے ذرے سے اول صاحبِ قوت وارادہ ہستی، الرَّحمٰن ذوالجلال والاکرام سے متعارف ہونا اور انہیں پہچاننے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔

**کائنات میں ہر شئے کا وجود ایک ارادے کی موجودگی پر مطلع کرتا ہے۔ ارادہ ہستی کا ہوتا ہے۔ اس طرح کائنات کی ہر شئے ایک ہستی کے وجود کی شہادت دیتی** ہے۔ شئے کا وجود ارادے کو ظاہر کرتا ہے اور ارادہ مقصد کے تابع ہوتا ہے۔ **اس طرح کائنات کی ہر شئے اظہارِ مقصد ہے۔** اور جب ہر شئے متعین فطرت اور تقدیر کی پابند ہو تو وہ خواہش و مرضی سے عاری، تابع فرمان اور تسخیر شدہ ہوتی ہے اور تفکر کرنے والوں کو اپنے وجود کے مقصد کا اظہار بھی کر دیتی ہے۔

ہم نے اول مرتبہ ایسے فعل کو استعمال کیا ہے جس کے باب میں "مغالبہ" کے خصوصی معنی شامل ہوتے ہیں۔ اس کے ماخذ میں سمو یا بنیادی تصور دو کے مابین تعلق اور نسبت ہے، آقا اور غلام؛ مالک اور ملازم؛ حاکم اور محکوم؛ غالب اور مغلوب اور معبود اور عابد۔ جس شئے میں اِس قدر کشش ہو کہ کسی دوسری شئے کو اپنی جانب کھینچ لے تو کشش رکھنے والی شئے غالب اور دوسری شئے مغلوب ہو جاتی ہے۔ اور جو غالب ہے وہ حکمران ہے اور مغلوب ہونے والی شئے محکوم کہلاتی ہے۔ اور جو محکوم ہے وہ غلام ہے اور غلام اپنی حریت، ارادہ و اختیار کی قوت و صلاحیت کو اُس کے تابع کر دیتا ہے جو اُس پر غالب / حکمران ہے۔ اِس لئے "اَلعَبدُ" غلام کو کہتے ہیں جو ایسے شخص کا متضاد ہے جس کے ارادہ و اختیار یعنی حریت میں کسی دوسرے کے ارادہ و اختیار کی آمیزش یعنی حکمرانی نہیں جسے سیدھے سادے انداز میں ہم معاشرے کا آزاد انسان کہتے ہیں۔ قرءانِ مجید اپنے الفاظ اور اصطلاحوں کے معنی اور مفہوم کو قاری کے سمجھنے کیلئے انتہائی سہل انداز میں خود واضح کرتا ہے۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ

اگر مجرم قرار پایا شخص خود مختار ہے تو وہی سزا پائے گا، اور اگر کسی کا پابند، ملازم ہے تو وہی پابند شخص، اور اگر خاتون ہے تو وہی خاتون۔ (حوالہ البقرۃ۔۱۷۸)

فَقَالُوٓاْ أَنُؤۡمِنُ لِبَشَرَيۡنِ مِثۡلِنَا

اس خود پرستانہ انانیت کے سبب انہوں نے آپس میں کہا "کیا ہم اپنے جیسے دو بشروں پر ایمان لے آئیں

وَقَوۡمُهُمَا لَنَا عَٰبِدُونَ ٤٧

باوجود اس کے کہ ان کی قوم خاص طور پر ہمارے لئے غلاموں/رعایا کا کام کرتی ہے"۔(المومنون۔۴۷)

بندگی انسان کا اظہار عجز وانکساری ہے۔ **بندگی کا وسیع تر مفہوم اپنی زندگی کو کسی دوسرے کی صوابدید پر منظم کرنا ہے۔** کسی دوسرے کی صوابدید پر یہ عمل اگر صرف اس بناء پر کیا جائے کہ وہ طاقتور اور غالب ہے تو بندگی کا مفہوم غلامی اور انسان کا اپنی کمزوری، عجز اور مغلوبیت کا اقرار ہے۔ اطاعت صرف دو وجہ سے ہوتی ہے قوت، طاقت، غلبہ کے خوف سے یا پھر محبت کے زیر اثر۔ انسان کیلئے خوف اور غم دو ایسی کیفیات ہیں جو کمزوری اور بے بسی کا احساس دلاتی ہیں اور خواہش ابھارتی ہیں کہ کسی قوت اور غلبے والے کی پناہ، رفاقت اور مدد میسر آجائے۔

مادہ ''ع ب د'' میں سموئے بنیادی تصور اور اُس کے معنی و مفہوم سے اِس اظہار '' نَعۡبُدُ'' کا مطمح نظر ہے کہ انسان اپنی حریت، ارادہ واختیار کی قوت وصلاحیت کو اپنے رب کا محکوم بنادے، اپنے آپ کو اپنے رب کا غلام بنا کر اُس کی خواہش، مرضی اور حکم کا یوں تابع ہو جائے جیسے ایک زیر تسلط غلام جو کسی شئے پر قدرت واختیار نہیں رکھتا۔ اِس طرح '' نَعۡبُدُ''، یعنی بندگی/محکومی انسان کی زندگی کے ہر ایک لمحے پر محیط رہنے والا تصور ہے۔ لیکن یہ تعلق رب اور عبد کے مابین ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی اِس بات کا احساس اور انسان کے کسی کا ''اَلعَبدُ'' ہونے کا اظہار ''عبادت'' ہے۔ ''عبادت'' '' نَعۡبُدُ'' کا ایک جزو ہے جبکہ ''اَلعَبدُ'' یعنی اپنے آپ کو محکوم سمجھنا اور اپنے رب کے ارادہ واختیار کے زیر تسلط رہنا ہر ایک لمحے پر محیط ہے۔

یہ اول جملہ فعلیہ ہے جو ہماری زبان سے ادا ہوا۔ **اِس سے قبل جملہ اسمیہ کے ذریعے کائنات کی تمام حقیقت اور آفرینش سے آخرت تک کے زمان کو سمیٹ کر ہم نے محض تیرہ الفاظ میں بیان کر دیا۔** ہم نے بتایا کہ **ابتداء سے منتہا ہمارے تصور اور بصیرت میں بالکل واضح ہے۔**

آقائے نامدار ﷺ کی نزول قرءانِ مجید سے قبل تفکر کی عادت، جسے اللہ تعالیٰ نے انہیں یہی ایک نصیحت ہمیں بھی کرنے کا کہا (حوالہ سباء۔۴۶)، اپناتے ہوئے **اِن تیرہ الفاظ پر کچھ دیر تنہائی میں تفکر کریں تو تمام زمان اور وسعتیں سمٹ کر بصارتوں میں سما جائیں گی۔** اللہ تعالیٰ کی تخلیقات میں ہم سے زیادہ سیانا اور دانا وبینا کوئی نہ ہو گا جو اِس مختصر انداز میں سب کچھ سمیٹ کر بیان کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کیلئے حمد مخصوص ہے جنہوں نے ہماری ادئیگی کیلئے یہ الفاظ کائنات کی عظیم تخلیق اور ہمارے رہنما، آقائے نامدار، رسولِ کریم ﷺ کی زبان مبارک میں مرتب فرما کر عنایت فرمائے۔ یہ عربی مبین کا اعزاز ہے کہ اِس سے بڑھ کر جامعیت اور وسعت کسی عجمی زبان کو بلکہ شاید عجم کو مجموعی طور بھی حاصل نہیں۔

**علم اور عقل کی آخری منزل مقصد شئے وحیات تک پہنچنا ہے اور اِس کا واحد ذریعہ تفکر ہے جس کیلئے آزادی، تنہائی چاہیئے۔**

ہستی کا اظہار تخلیق ہے۔ تخلیق شئے اور حیات ہے۔ تخلیق مقصد سے ہے۔ مقصد ارادے سے ہے۔ ہر شئے کا کوئی خالق ہے۔ تخلیق خالق کا ارادہ ہے۔ ارادہ ہستی کا ہے۔ تخلیق خالق کے ارادے کا اظہار ہے۔ وجودِ شئے اپنے خالق کی ہستی کا مظہر ہے۔ تخلیق ہستی کی پہچان ہے۔ علم تخلیق کا ہے۔ شئے کو جاننا ہے۔ شئے کا مقصد ہے ۔ منتہائے علم مقصدِ شئے کو جاننا ہے۔ مقصدِ شئے خالق کے ارادے کا اظہار ہے۔ منتہائے علم خالق کے ارادے کو جاننا ہے۔ ارادہ ہستی کا ہے۔ علم ہستی کو جاننے کا نام ہے۔ علم حقیقت کی پہچان کراتا ہے کہ اول وآخر ہستی ہے باقی سب کچھ شئے یا شئے سے ہے اور شئے کو فنا ہے جبکہ ہستی کو دوام ہے۔ اِس ابتداء اور منتہا کو ہمارے رہنما، آقائے نامدار ﷺ نے چار لفظوں میں سمیٹ دیا تھا:

ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ٢

اللہ تعالیٰ کیلئے عظمت وبرتری وشرف وکبریائی کو بیان کرتی حمد کو ہمیشہ کیلئے مختص فرما دیا ہے

وہ موجود ومعلوم تخلیق کردہ دنیاؤں/ہر ایک وجود پذیر کے رب ہیں۔(۲)

یہ تصور اپنی وسعتوں، رعنائیوں، حقیقتوں سمیت بصارت وبصیرت میں سمٹ جائے تو خلوص دل سے عمل کی ترغیب دیتا ہے۔ ہم نے دست بستہ، جھکے سر اور نگاہوں کے ساتھ عرض کیا۔ إِيَّاكَ نَعۡبُدُ۔ ''آپ اور صرف آپ ہیں جن کی بندگی ہم تسلسل سے بااظہار کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے''۔ ہم نے ثابت کر دیا کہ تفکر مقصود شئے

سے انسان کو حقیقت تک لے جاتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ ٱلْجِنَّ وَٱلْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾

اور میں نے جن وانس کو صرف اِس لئے تخلیق کیا ہے کہ وہ بطیب خاطر میری بندگی/محکومی کریں۔(الذاریات۔۵۶)

سبحان اللہ! طاقت کے بل بوتے پر منوانا بھی کوئی ماننا ہے، یہ اظہارِ بندگی نہیں اظہار مجبوری وکمزوری کہلاتا ہے۔ **تفکر کے نتیجے میں ماننا در حقیقت ماننا ہے کہ اس میں محبت، رضا و رغبت اور خلوص ہوتا ہے۔** اور کائنات کی تخلیق کی اِس خواہش اور مقصد کی تکمیل میرے اور آپ کے آقا، آقائے نامدار ﷺ نے غارِ حرا کی تنہائیوں میں تفکر کر کے پوری کر دی تھی۔ **تفکر کیلئے ماحول، اردگرد کی دنیا یہاں تک کہ اپنے دل و دماغ میں بسے علم و خواہشات کی قید کی زنجیر سے آزادی چاہئے۔** تفکر جستجوئے حقیقت ہے۔ اور آقائے نامدار ﷺ نے بن طلب، کتاب عنایت کئے جانے پر، اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تعمیل میں اپنی ذات کا یہ راز بھی افشاں فرما کر ہمیں سمجھا دیا کہ بندگی اور اخلاص کی منتہا یہ ہے:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِى وَنُسُكِى

آپ (ﷺ) دنیا کو بتادیں" یہ حقیقت ہے کہ میری صلوۃ، اور میرے اعمال،

وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِى

اور میری حیات اور میری طبعی موت،

لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٦٢﴾

ازل سے اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص و مختص کی گئی ہے جو تمام موجودات کے رب ہیں"۔(الانعام۔۱۶۲)

"میرا جینا اور میرا مرنا" انسان کے ظہور سے آخری سانس تک زندگی کا ایک ایک لمحہ ہے۔ یہ آپ ﷺ کی قرءانِ مجید سے قبل اور بعد کی حیات طیبہ کی مکمل تاریخ، بائیو گرافی ہے جسے ایک جملے میں انتہائی جامعیت سے سمویا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے بموجب اِس طشت از بام کئے گئے راز پر کچھ دیر تنہائی میں تفکر کریں تو عیاں ہو جائے گا کہ ہمارے رہنما، آقائے نامدار ﷺ کی سیرت مبارکہ کا احاطہ کرنا کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ اور اِس کے بعد جوں جوں قرءانِ مجید کے مطالعہ میں آگے بڑھتے جائیں گے تو ہمیں ایسے لگے گا جیسے **اِس کا بیشتر حصہ آپ ﷺ کی حیات کو اِس انداز میں بیان فرماتا ہے کہ ہمیں آج بھی وہ متحرک دکھائی دے۔ یہ یاد رہے کہ حرکت کے نقوش مٹتے نہیں۔**

آپ ﷺ کا یہ فرمان ازل سے ابد ہر ایک لمحہ پر محیط ہے۔ یہ بندگی کی اوج ثریا ہے۔ **یہ وہ مقام ہے جہاں قرءانِ مجید آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ کی ذات اقدس میں مجسم ہوتا ہے اور تحریر اور حیات باہم ایک محسوس ہوتے ہیں۔** بندگی تخیل کی اڑانوں کا نام نہیں، ہر لمحہ عمل و کاوش کا نام ہے۔ اور قرءانِ مجید کی آیات مبارکہ پر اگر ہم بتدریج عمل کرتے جائیں تو پھر آیات صرف تحریر نہیں رہتی بلکہ آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ اور اُن کے رب کے بتدریج قرب کا وسیلہ بن جاتی ہیں اور خوف اور حُب باہم گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ خوف حُب محسوس ہو اور حُب خوف لگے۔

آپ ﷺ کا یہ فرمان "اَلعَبدُ" کی معراج ہے اور عالمین کے خالق رب العالمین کی طرح جو یکتا ہیں، احد ہیں، اُن کا ہمسر کوئی نہیں **اور اُن کی مخلوقات میں یہ "اَلعَبدُ" یکتا ہیں اُن کا ہمسر کوئی نہیں۔ اور مخلوقات میں اِن یکتا "اَلعَبدُ" کا استحقاق مقام محمود اہے کہ تمام کی تمام حمد رب العالمین کیلئے ہے اور مخلوقات میں سے اگر کسی کیلئے حمد ہے تو صرف میرے آقا، آقائے نامدار ﷺ کی ذات اقدس کیلئے ہے۔** اُن پر درود و سلام ہے ہر لمحہ صبح و شام بغیر کسی انقطاع کے۔

اللہ تعالیٰ سے ہم نے کہا، اقرار کیا اور انہیں وعدہ، عہد دیا کہ ہم اپنے قول پر قائم رہتے ہوئے آئندہ بھی بندگی کریں گے۔ انہیں مخاطب کر کے ہم نے مزید کہا: وَإِيَّاكَ

**نَسۡتَعِينُ**:اللہ تعالیٰ کے کلام میں یہ جملہ ایک بار ہے۔

فعل مضارع مرفوع جمع متکلم،متعدی،باب اِسۡتَفۡعَلَ سے ہے،مصدر استعانۃ۔اور مادہ"ع و ن" ہے جس کے بنیادی معنی اور تصور اعانت،تعاون کرنا ہے۔اس باب میں اس بات کے طلبگار اور خواہش مند ہونے کے معنی شامل ہوتے ہیں جو اس کے بنیادی باب کے معنی ہیں اور یہ کہ فاعل اس فعل کو از راہ "تکلف"،یعنی اپنے آپ پر اس کو تفویض کر لیتا ہے۔اللہ تعالیٰ،الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام سے ہم طلبگار اعانت ہوتے ہیں۔ہم نے اپنے آپ کو اس کا مکلف بنالیا ہے کہ اعانت کے لئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ،الرّحمٰن ذوالجلال والاکرام سے رجوع کریں۔

اس کے بنیادی باب کے معنی اعانت ہیں۔

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوۡمِهِ ٱسۡتَعِينُواْ بِٱللَّهِ وَٱصۡبِرُوٓاْۖ

موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لئے پیغام دیا "اللہ تعالیٰ سے استعانت کے طلبگار رہو؛اور استقلال واستقامت سے سے اپنے نظریہ پر قائم رہتے ہوئے ناگفتہ بہ وقت کو حوصلے اور ضبط و تحمل سے برداشت کرو۔(حوالہ الاعراف۔۱۲۸)

---

وَٱللَّهُ ٱلۡمُسۡتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ۝١٨

اور اللہ تعالیٰ ہی ہیں جن سے طلبگار اعانت ہوں اس کے لئے جو بڑھا چڑھا کر جھوٹ تم بیان کر رہے ہو"۔(حوالہ سورۃ یوسفؑ۔۱۸)

---

وَرَبُّنَا ٱلرَّحۡمَـٰنُ ٱلۡمُسۡتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ۝١١٢

اور انہوں نے مخاطبین سے کہا" ہمارے رب الرّحمٰن (ذوالجلال والاکرام) ہیں،وہ اعانت فرمانے والے ہیں،ان ہی سے رجوع کیا جا سکتا ہے ان باتوں پر جو تم اپنے تخیل سے بیان کر رہے ہو"۔(الانبیاء۔۱۱۲)

**تَصِفُونَ** کا مادہ "و ص ف" اور اس کے معنی کسی چیز کا حلیہ اور کیفیت بیان کرنا ہیں۔قرءانِ مجید میں تخیل سے اختراع کی ہوئی اُن باتوں کیلئے استعمال ہوا ہے جو محض زبان سے (عقل و فکر سے نہیں) لوگ بیان کر دیتے ہیں۔

اور قرءانِ عظیم میں آخری ہدایت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ سے شر الوسواس الخناس سے بچاؤ کیلئے پناہ مانگو کیونکہ شیطان صفت جن وانس کے تخیل سے اختراع کی ہوئی مسحور کن اور دلفریب باتوں کا شر ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی بات کو پیچھے ہٹا کر،اسے چھپا کر،پس پشت ڈال کر قلوب میں ایسے میٹھے اضطراب،دلفریب آرزو اور امید کے تصور کو ابھارتا ہے جس سے انسان بلاارادہ بھی اللہ تعالیٰ کی بات کو بھلانے کی لغزش کا مرتکب ہو سکتا ہے جس کی قیمت اتنی مہنگی چکانی پڑتی ہے کہ جنت ہاتھوں سے نکل جائے۔

إِيَّاكَ نَعۡبُدُ

آپ اور صرف آپ جناب ہیں جن کی بندگی ہم تسلسل سے بااظہار کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے

وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ ۝5

اور صرف آپ ہیں جن سے اپنی شخصیت کو اوج ثریا پر لے جانے کیلئے اعانت کے ہم طلبگار ہیں۔(الفاتحۃ۔۵)

ہم دنیا میں بھی کسی قوت والے سے کوئی ایسی بات کہنے کی جرأت نہیں کرتے جسے پورا نہ کر سکیں۔اِس لئے تمام کی تمام قوت وغلبہ کے مالک سے جو وعدہ کر رہے ہیں اُس کے متعلق ایک بار پھر سنجیدگی سے سوچ لیں کہ ہم اسے نباہنے کا ارادہ رکھتے ہیں یا نہیں کیونکہ وعدے کے بارے میں تو عام سی قوت والا بھی پوچھتا ضرور ہے۔

الحمدللہ ہم نے دل کو ٹٹولا تو اپنے آپ کو اِس اظہار بندگی میں مخلص پایا، اور اس سے بھی ظاہر کیا کہ ہم اپنی ذات کیلئے اعتدال کی خواہش رکھتے ہوئے۔نَسۡتَعِينُ طلبگارِ اعانت ہیں، اسی لئے تو درخواست کر رہے ہیں:

ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٲطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ

[اِس لئے عام انسان کیلئے مختص کردہ اوج ثریا پر جانے کیلئے]

آپ صراط مستقیم: منزل کی جانب رواں دواں رکھنے والے راستے پر ہمیں رہنمائی، /ہدایت دیتے رہیں۔(٦)

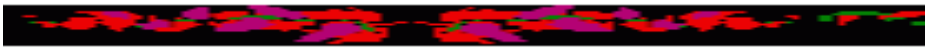



۔ترجمہ آیت۔٦۔

ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٲطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ

[اِس لئے عام انسان کیلئے مختص کردہ اوج ثریا پر جانے کیلئے]

آپ صراط مستقیم: منزل کی جانب رواں دواں رکھنے والے راستے پر ہمیں رہنمائی، /ہدایت دیتے رہیں۔(٦)

آیت مبارکہ کے الفاظ کی صرف و نحو و معنوی تحلیل (ویڈیو)

تحلیل نحوی و صرفی: تشریح معنوی و مفہوم، بلاغت

آیات مبارکہ چھ اور سات (تیرہ الفاظ) ایک جُملہ مُلتَف ۔ مَخلُوط (complex sentence) پر مشتمل ہیں۔یہ ایسا جملہ ہے جس میں ایک (independent clause) مطلق جملہ ہو اور کم از کم ایک ذیلی جملہ (dependent clause) ہو۔

ٱهۡدِنَا۔دعائیہ جملہ فعلیہ ، فعل امر، آخری حرف ''ی'' حذف، ضمیر فاعل مستتر: واحد مذکر حاضر، مخاطب اللہ تعالیٰ، الرّحمن ذوالجلال و الاکرام ۔فعل متعدی، مادہ ''ھ د ی''۔نَا۔ضمیر متصل جمع مذکر متکلم، فی محل نصب، اول مفعول بہ۔یہ جملہ فعلیہ کلام میں ایک بار آیا ہے۔یہی جملہ آخر میں طوالت کے نشان کے ساتھ ٱهۡدِنَآ سورۃ صٓ (۳۸) کی آیت۔۲۲ میں موجود ہے مگر متکلم اور مخاطب مختلف ہیں اور وہاں ایک مفعول سے متعدی ہے۔

مادہ ''ھ د ی'' کے بنیادی معنی نمایاں اور روشن ہونا، آگے ہونا اور دوسروں کے آگے آگے چلنا ہیں۔چنانچہ دن کو روشن ہونے کی وجہ سے هُدًى۔کہا جاتا ہے۔اور هادِيةٌ۔اس ابھری چٹان کو کہتے ہیں جو پانی میں دور سے نظر آجائے (تاج و محیط)۔مبہم مفروضہ اور بات جسے سمجھنے اور نتیجہ اخذ کرنے کیلئے ظن، گمان اور قیاس سے اندازہ لگانا پڑے گا ۔هُدًى. کا درجہ نہیں پاسکتا۔اور اسی طرح کسی بھی بات، پہچان اور شناخت کو جسے گمان اور ظن سے پہچان اور شناخت کرنے کیلئے چند دوسرے لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے ۔هُدًى۔نہیں کہا جاسکتا۔ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی راستہ بتانے کیلئے آگے بڑھ جانا ہیں۔هَدَىٰ کے معنی راستہ کو پہنچوا

دیتا، واضح کرتا، راہنمائی کرتا ہیں۔ هُدًى کے معنی راہنمائی کی بجائے رہنما بھی ہوتے ہیں۔ "ہدایت" وہ ہے جو واضح، روشن، نمایاں، کھلی ہوئی، غیر مبہم، ابھری ہوئی ہو کہ راہنمائی کرے، راستہ دکھائے۔

ٱلصِّرَٰطَ ٱلْمُسْتَقِيمَ۔ معنی، مفہوم اور اہمیت

مرکب توصیفی: اللہ تعالیٰ کے کلام یہ مرکب دو بار منصوب اور دو بار مرفوع حالت میں ہے۔ دونوں منصوب حالت میں مفعول ثانی ہے۔

وَهَدَيْنَٰهُمَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلْمُسْتَقِيمَ ۝١١٨

اور ہم جناب نے ان دونوں (موسیٰ اور ھارون علیہما السلام) کو منزل کی جانب رواں راستے پر گامزن حالت میں رہنمائی سے مستفید فرمایا۔ (الصافات۔١١٨)

ٱلصِّرَٰطَ۔ واحد، مذکر، منصوب بالفتح [یعنی آخر میں زبر] مفعول بہ ہمیشہ منصوب ہوتا ہے، اور جن الفاظ پر زبر ظاہر نہیں ہوتی انہیں حالت نصب میں کہتے ہیں۔ یہ اسم، معرفہ باللام ہے، اس مقام پر حرف کی قسم "العَهدُ الذِهنیّ" ہے کیونکہ اس سے پہلے یہ بیان نہیں ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے تصور اور علم میں پہلے سے ہے۔ یہ مادہ "ص ر ط" سے ہے جس میں سمویا بنیادی تصور کسی شئے کو چبائے بغیر نگل لینا ہیں۔ یہ راستے کو کہتے ہیں، استوار اور نمایاں کی ہوئی سطح زمین جس پر چل کر منزل کو پہنچا جا سکے۔ منزل پر پہنچنے کے لئے سفر کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کو نگل (engulfing) لیا جارہا ہے۔

ٱلْمُسْتَقِيمَ: یہ مرکب توصیفی میں اسم صفت ہے۔ یہ اسم فاعل باب استفعل اور مصدر استِقامۃٌ سے ہے۔ اس کا مادہ "ق و م" جس کے بنیادی معنی دونوں پاؤں پر سیدھے کھڑا ہونا ہے۔ یہ بیٹھے ہونے اور کروٹ کے بل لیٹے ہونے کی نسبت زیادہ مستحکم، طاقت، چاک و چوبند، اور خطرے یا حملے کی صورت میں فوری رد عمل کے حوالے سے زیادہ موزوں پوزیشن ہے۔ اس کا عام فہم ترجمہ "سیدھا راستہ" کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جو ثابت قدم رکھتا ہے، استقامت اور استقلال بخش ہے۔ منزل کی جانب استقلال اور ثابت قدمی سے رواں دواں رکھتا ہے۔ اور منزل قیام، سکون اور سلامتی کی جگہ ہے۔

وَٱللَّهُ يَدْعُوٓا۟ إِلَىٰ دَارِ ٱلسَّلَٰمِ

اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو امن، سکون و سلامتی، خوف وحزن سے منزہ قیام گاہ کی جانب محو سفر ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔

وَيَهْدِى مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝٢٥

وہ جناب اس شخص کو جس کے متعلق رضامند ہوتے ہیں کہ متمنی ہدایت ہے صراط مستقیم کی جانب گامزن فرمادیتے ہیں۔ (یونسؑ۔٢٥)

صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ: وہ راستہ ہے جو انسان کو اس کی منزل دارالسلام یعنی خوف و غم سے منزہ قیام کی جگہ پہنچا دیتا ہے۔

ہم نے دعا کرنے سے قبل کہا تھا۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ: انسانی تاریخ میں اس طرز عمل کو صراط مستقیم قرار دیا گیا ہے:

إِنَّ ٱللَّهَ رَبِّى وَرَبُّكُمْ فَٱعْبُدُوهُ ۗ

(عیسیٰ علیہ السلام نے مزید فرمایا) یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے رب ہیں اور تم لوگوں کے رب ہیں۔ اس لئے اُن کی باظہار بندگی کرو۔

هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝٥١

یہ اظہار بندگی صراط مستقیم: منزل کی جانب رواں دواں رکھنے والا راستہ ہے"۔ (ءالِ عمرام۔٥١)

إِنَّ ٱللَّهَ هُوَ رَبِّى وَرَبُّكُمْ فَٱعْبُدُوهُ ۚ

(عیسیٰ علیہ السلام نے مزید فرمایا) یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ جناب ہیں جو میرے رب ہیں اور تم لوگوں کے رب ہیں۔ اس لئے ان کی بااظہار بندگی کرو۔

هَـٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦٤﴾

یہ اظہار بندگی صراط مستقیم: منزل کی جانب رواں دواں رکھنے والا راستہ/طرز عمل ہے"۔ (الزخرف۔ ۶۴)

اللہ تعالیٰ کی مطلق بندگی سے جو لوگ اجتناب کرتے ہیں، وہ منزل کی جانب رواں دواں رکھنے والے راستے کو اختیار نہیں کرتے، وہ مجرمین ہیں جن کی آخری منزل جہیل (جہنم) ہے:

وَٱمْتَـٰزُوا۟ ٱلْيَوْمَ أَيُّهَا ٱلْمُجْرِمُونَ ﴿٥٩﴾

اور حکم دیا جائے گا "اے مجرم قرار پاجانے والو، سنو! آج تم لوگ اپنی صف بندی الگ کر لو۔

أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَـٰبَنِىٓ ءَادَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا۟ ٱلشَّيْطَـٰنَ ۖ

کیا میں نے تم لوگوں کو اس عہد کا پابند کرنے کا پیغام نہیں بھیجا تھا "اے بنی آدم! تم ہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ شیطان کی غلامی نہ کرنا۔

إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿٦٠﴾

یہ حقیقت کہ وہ (شیطان) تم لوگوں کے لئے علی الاعلان دشمن ہے۔

وَأَنِ ٱعْبُدُونِى ۚ

اور کیا میں نے تم لوگوں کو اس عہد کا پابند کرتے ہوئے یہ حکم نہیں دیا تھا "تم لوگ میری بااظہار بندگی کرو۔

هَـٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾

یہ اظہار بندگی صراط مستقیم: منزل کی جانب رواں دواں رکھنے والا راستہ/طرز عمل ہے"۔ (یٰسٓ۔ ۶۱)

آج بھی لوگوں سے پوچھا جارہا ہے اور انہیں سادا ترین الفاظ میں بتایا جارہا کہ منزل کی جانب رواں دواں رکھنے والا راستہ/طرز عمل کیا ہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ

مگر تم لوگ کیسے قرءان مجید کو پس پشت ڈال سکتے ہو، اس سے غفلت برت سکتے ہو۔ نگاہوں سے اوجھل کر سکتے ہو؟

وَأَنتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ءَايَـٰتُ ٱللَّهِ

جبکہ تم لوگ اس حال میں ہو کہ اللہ تعالیٰ کی آیات لفظ بلفظ تم لوگوں کو سنائی جاتی ہیں۔

وَفِيكُمْ رَسُولُهُۥ ۗ

اور اس حال میں ہو کہ ان جناب کے رسول (محمد ﷺ) تم لوگوں کے مابین بحثیت نذیر/متنبہ کرنے والے اور معلم موجود ہیں (محذوف خبر کے لئے حوالہ الانعام۔ ۱۹)۔

وَمَن يَعْتَصِم بِٱللَّهِ

اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مرجع خلائق کا تعلق استوار کرلیتا ہے

فَقَدۡ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ١٠١

تو یقیناوہ منزل کی جانب رواں دواں رکھنے والے راستے کی جانب ہدایت دے دیا گیا۔(ءال عمران۔۱۰۱)

---

فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ فَيُوَفِّيهِمۡ أُجُورَهُمۡ

چونکہ اتمام حجت کر دیا گیا ہے اس لئے جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اور انہوں نے ان جنابؑ کے ساتھ مرجع خلائق کا تعلق استوار کر لیا۔

فَسَيُدۡخِلُهُمۡ فِي رَحۡمَةٖ مِّنۡهُ وَفَضۡلٖ

تو حسب وعدہ وہ جناب انہیں ان کی جانب سے پزیرائی اور قدر دانی کے مظہر کے طور رحمت اور فضل کی چھاؤں میں داخل کرتے رہیں گے۔

وَيَهۡدِيهِمۡ إِلَيۡهِ صِرَٰطٗا مُّسۡتَقِيمٗا ١٧٥

اور انہیں ان کی جانب پہنچنے کے لئے رواں دواں رکھنے والے راستے پر رہنمائی دیتے رہیں گے۔(النساء۔۱۷۵)

---

يَهۡدِي بِهِ ٱللَّهُ مَنِ ٱتَّبَعَ رِضۡوَٰنَهُۥ سُبُلَ ٱلسَّلَٰمِ

اللہ تعالیٰ اس (قرءان مجید) کے ذریعے اس شخص کو دائمی سلامتی کے اطوار اور طرز عمل کی ہدایت دیتے ہیں جو اُس میں تصویب کردہ (approved) کی رغبت وخوشی سے اتباع کرتے ہیں۔

وَيُخۡرِجُهُم مِّنِ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ بِإِذۡنِهِۦ

اور وہ (رسول کریم ﷺ) انہیں تاریکیوں سے نکال کر حیات بخش روشنی کی جانب لے جاتے ہیں، ان (اللہ تعالیٰ) کی پیشگی اجازت سے۔

وَيَهۡدِيهِمۡ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ١٦

اور وہ (رسول کریم ﷺ) انہیں رہنمائی دیتے ہیں اس راستے کی جانب جو منزل کی جانب رواں دواں رکھتا ہے۔(المائدہ۔۱۶)

---

وَٱلَّذِينَ كَذَّبُواْ بِـَٔايَٰتِنَا

اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جنہوں نے ہماری پہنچائی گئی آیتوں کو لوگوں کے سامنے برملا جھٹلا دیا

صُمّٞ وَبُكۡمٞ فِي ٱلظُّلُمَٰتِۗ

یہ لوگ دانستہ بہرے اور گونگے بنتے ہیں۔ وہ اندھیروں میں بھٹکتے رہنے پر مصر ہیں۔

مَن يَشَإِ ٱللَّهُ يُضۡلِلۡهُ

متنبہ رہو؛ جس کسی کے انحراف کے متعلق اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتے ہیں کہ دانستہ ہے اسے منحرف حالت میں رہنے دیتے ہیں۔

وَمَن يَشَأۡ يَجۡعَلۡهُ عَلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ٣٩

اور جس کسی کے متعلق فیصلہ کرتے ہیں کہ م تمنی ہدایت ہے اس کے لئے قرءان مجید کو صراط مستقیم پر گامزن رہنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ (الانعام۔۳۹)

اللہ تعالیٰ نے ہر موضوع اور تصور کو نظریئے اور عمل کے حوالے سے متمیز فرمایا ہے۔ ہم نے دعا کرنے سے قبل کہا تھا: إِيَّاكَ نَعۡبُدُ۔ اوپر بیان کردہ آیات میں انسانی تاریخ

میں اس طرز عمل کو منزل کی جانب رواں دواں رکھنے والا راستہ قرار دیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کے حکم۔ ٱعۡبُدُونِى "تم لوگ میری بااظہار بندگی کرو "، کی تعمیل کو.

صِرَٰطٌ مُّسۡتَقِيمٌ. قرار دیا گیا ہے۔بندگی کا وسیع تر مفہوم اپنی زندگی کو کسی دوسرے کی صوابدید پر منظم کرنا ہے۔اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے انداز میں اپنی زندگی کو منظم کرنا اور ان کے متعین کردہ طرز عمل کو استقلال سے اپنائے رکھنا, صِرَٰطٌ مُّسۡتَقِيمٌ. ہے۔

ممکن ہے کہ زیادہ میخ نکالنے اور خواہ مخواہ بحث میں الجھنے والا کوئی شخص یہ کہہ دے کہ یہ تو محض الہیات (theology) اور مذہبی عقیدے سے متعلق ہے۔مگر ایسا نہیں ہے۔ **یہ ایک طرز عمل ہے جس پر مسلسل کاربند رہتا ہے۔یہ ایک زندگی سے دوسری زندگی کا سفر پیہم ہے۔یہ ایک ضابطہ حیات کی مسلسل پابندی ہے جو ایک پر سکون اور خوشگوار حیات کے تسلسل کی ضامن منزل پر پہنچادے گی۔**صِرَٰطٌ مُّسۡتَقِيمٌ. کے معنی کوئی مرئی راستہ نہیں۔یہ اصطلاح ہے ، یہ طرز عمل ہے جو مکمل ضابطہ حیات پر محیط ہے۔بتایا گیا:

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهۡدِيَهُۥ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهُۥ لِلۡإِسۡلَٰمِۖ

چونکہ انسان صاحب حریت قرار دیا گیا ہے اسلئے اگر متمنی ہدایت جانچ کر اللہ تعالیٰ جسے ہدایت یافتہ بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے سینے کو متعین کردہ ضابطہ حیات،اسلام پر کاربند رہنے کے لئے کشادہ فرمادیں گے۔

وَمَن يُرِدۡ أَن يُضِلَّهُۥ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى ٱلسَّمَآءِۚ

اور اگر وہ جناب کسی کو بضد ہٹ دھرم جانچ کر اس کو اس کے انحراف میں گم کردہ راہ رہنے دینے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے سینے کو گھٹن سے سکڑا ہوا کردیں گے ایسے جیسے وہ از خود آسمان میں بلند ہو رہا ہو۔

كَذَٰلِكَ يَجۡعَلُ ٱللَّهُ ٱلرِّجۡسَ عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يُؤۡمِنُونَ ۝١٢٥

اس طرح اللہ تعالیٰ ان کے ہٹ دھرم منحرف طرز عمل کو ایسے لوگوں پر چسپاں التباس واضطراب کی آلودگی کا درجہ دے دیتے ہیں جو رسول کریم اور قرءان مجید پر ایمان نہیں لاتے۔(الانعام-۱۲۵)

اسلام ضابطہ حیات ہے،یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقرر کردہ اسلان کے لئے آئین ہے۔یہ متعین کردہ راستہ ہے جو انسان کو منزل کی جانب رواں دواں رکھتا ہے۔

وَهَٰذَا صِرَٰطُ رَبِّكَ مُسۡتَقِيمًاۗ

آپ (ﷺ) تصدیق کردیں کہ یہ ضابطہ حیات اسلام پر کاربند رہنا آپ کے رب کا متعین کردہ راستہ (طرز عمل) ہے۔یہ منزل کی جانب رواں دواں رکھتا ہے۔

قَدۡ فَصَّلۡنَا ٱلۡأَيَٰتِ لِقَوۡمٍ يَذَّكَّرُونَ ۝١٢٦

ہم جناب نے آیات کو جداجدا موضوعات کے فریم میں تالیف کردیا ہے ان لوگوں کے لئے جو از خود یادداشت میں محفوظ کرکے نصیحت وہدایت لیتے رہتے ہیں۔(الانعام-۱۲۶)

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ کو مخاطب کرکے اسلام کو۔صِرَٰطُ رَبِّكَ۔قرار دیتے ہوئے اس کا" **حال**۔circumstantial adverb" مُسۡتَقِيمًا بتایا۔ ٱلۡإِسۡلَٰمُ: یہ مصدر ہے (مگر اسم علم،یعنی ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے دین/آئین حیات کا مخصوص نام بھی ہے)۔ **مصدر زمان ومکان کے حوالے کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔یہ ازل سے طے کردہ ہے۔اس مصدر کے معنی میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جو اعلیٰ ترین اخلاق کی حامل ہیں جن سے ماحول میں سلامتی،**

سکون، اعتدال، خیر، امن، اخوت، تحمل و برداشت، اور احساس تحفظ پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانعام کی آیات ۱۵۱۔۱۵۲ میں معاشرتی زندگی کو منظم کرنے کے لئے کئی احکام کی اتباع کا پابند کرتے ہوئے فرمایا:

وَأَنَّ هَـٰذَا صِرَٰطِى مُسۡتَقِيمًا

اور یہ کہ اس حکم نامہ پر کاربند ہونا میرا متعین کردہ راستہ/طرز عمل ہے۔ یہ منزل کی جانب گامزن رکھتا ہے۔

فَٱتَّبِعُوهُ ۖ

چونکہ یہ راستہ تمہیں منزل پر لے جائے گا اس لئے تم لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس طرز عمل کی بدرجہ اتم دلجمعی پیروی کرو۔

وَلَا تَتَّبِعُواْ ٱلسُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمۡ عَن سَبِيلِهِۦ ۚ

اور تمہیں منع کیا جاتا ہے کہ دانستہ معیار سے گرے ہوئے اطوار کی پیروی کرو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تم لوگوں کو ان (اللہ تعالیٰ) کے متعین کردہ راستے سے جدا کر دے گی۔

ذَٲلِكُمۡ وَصَّٮٰكُم بِهِۦ

یہ مذکورہ احکام ہیں جن کی تعمیل کا ان جناب نے تمہیں پابند کیا ہے۔

لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ﴿١٥٣﴾

اس کا مقصد یہ ہے کہ تم لوگ اپنے آپ کو محفوظ و مامون بنا سکو۔ (الانعام۔۱۵۳)

اب تک جو مطالعہ کیا ہے اس کے مطابق:

صِرَٰطٌ مُّسۡتَقِيمٌ۔ = ٱعۡبُدُونِى "تم لوگ میری بااظہار بندگی کرو" = ٱلۡإِسۡلَـٰمُ۔ متعین کردہ آئین اور ضابطہ حیات

اللہ تعالیٰ نے آقائے نامدار، رسول کریم سے فرمایا کہ اس موضوع کو مزید واضح فرمائیں:

قُلۡ إِنَّنِى هَدَٮٰنِى رَبِّىٓ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسۡتَقِيمٍ

آپ (ﷺ) ارشاد فرمائیں "بلاشبہ مجھے میرے رب نے اس راستے کی جانب دعوت دینے کی ہدایت فرمائی ہے جو کامیابی و کامرانی کی منزل کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ (محذوف کے لئے المومنون۔۷۳ کے ساتھ پڑھیں)

دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبۡرَٲهِيمَ حَنِيفًا ۚ

یہ معروف ہے ثبات و دوام کے حامل دین/ضابطہ حیات کے طور پر۔ ملت ابراہیم (علیہ السلام) کا دین، وہ ہمیشہ اس دین پر قائم تھے جیسے یہ خود ازل سے متعین ہے۔

وَمَا كَانَ مِنَ ٱلۡمُشۡرِكِينَ ﴿١٦١﴾

اور انہیں کبھی بھی ان کے زمان کے مشرکین/اصنام پرستوں کے ساتھ سمجھا اور گردانا گیا تھا"۔ (الانعام۔۱۶۱)

آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ صراط مستقیم کی طرف آنے کی دعوت دے رہے ہیں:

وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٧٣﴾

اور یہ حقیقت ہے، آپ (ﷺ) انہیں اس راستے کی جانب دعوت دے رہے ہیں جو کامیابی و کامرانی کی منزل کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ (المومنون۔ ۷۳)

---

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ

اور اس بیان کردہ زبانی رابطہ کے انداز میں ہم جناب نے آپ (ﷺ) کی جانب جاں افروز (قرءان مجید) کلام بھیجا۔ اس کلام کی خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ ہم جناب کے امر کا مبتدا و منتہا ہے۔

مَا كُنتَ تَدْرِى مَا ٱلْكِتَٰبُ وَلَا ٱلْإِيمَٰنُ

اس کو پیش کئے جانے سے قبل آپ (ﷺ) کی اہل کتاب سے نہ یہ جاننے کی عادت تھی کہ نازل کردہ منفرد کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ان کا ایمان کیا ہے۔

وَلَٰكِن جَعَلْنَٰهُ نُورًا

لوگوں کا یہ گمان کہ اساطیر الاولین سے آپ نے اسے مرتب کیا ہے غلط ہے، اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اسے (رُوحًا۔ قرءان مجید) نور/سفید روشنی قرار دیا ہے (جو تسلسلِ حیات کا ضامن ہے)۔

نَّهْدِى بِهِۦ مَن نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ

ہم جناب اس (قرءان مجید) کے ذریعے اپنے بندوں میں سے اس کو ہدایت دیتے رہتے ہیں جو متمنی ہدایت ہے۔

وَإِنَّكَ لَتَهْدِىٓ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٥٢﴾

اور یہ حقیقت ہے، آپ (ﷺ) یقیناً اس راستے کی جانب ہدایت دے رہے ہیں جو کامیابی و کامرانی کی منزل کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ (الشوری۔ ۵۲)

اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے متعلق یہ راز بھی فاش کر دینے کا حکم دیا:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِى وَنُسُكِى

آپ (ﷺ) دنیا کو بتادیں "یہ حقیقت ہے کہ میری صلوٰۃ، اور میرے اعمال،

وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِى

اور میری حیات اور میری طبعی موت،

لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٦٢﴾

ازل سے اللہ تعالیٰ کیلئے مخصوص و مختص کی گئی ہے جو تمام موجودات کے رب ہیں"۔ (الانعام۔ ۱۶۲)

"میرا جینا اور میرا مرنا" انسان کے ظہور سے آخری سانس تک زندگی کا ایک ایک لمحہ ہے۔ یہ "العَبدُ" کی معراج ہے کہ بندے کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے لئے مختص ہو۔

اس طرح۔صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ۔=ٱعْبُدُونِى "تم لوگ میری بااظہار بندگی کرو "=ٱلْإِسْلَٰمُ۔ متعین کردہ آئین اور ضابطہ حیات=دِينًا قِيَمًا ۔ یہ مرکب توصیفی ہے جس میں مصدر دین کے صفت کے مقام پر صفت مشبہ ہے جس میں دوام کا مفہوم اس کے معنی کا جزو ہے۔ یہ جملے میں صراط مستقیم کا حال بیان کر رہا ہے جو

اسے مطلق دوام کا حامل بنادیتا ہے۔اور پھر۔دِينًا قِيَمًا ۔کو ثبات ودوام کے حامل دین/ضابطہ کو۔مِّلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ،"ملت ابراہیم (علیہ السلام) کادین" سے بدل کر بیان فرمایااور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا حال۔حَنِيفًا۔بتایایعنی وہ اس دین پر ہمیشہ سے قائم تھے جیسے یہ خود ازل سے متعین ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک موضوع کو مختلف انداز اور زاویوں سے بیان فرماتے ہیں کہ کسی بھی تصور اور اصطلاح کے متعلق قاری کے لئے کوئی ابہام نہ رہے اور وہ مکمل طور پر اس کے احاطہ ادراک میں رچ بس جائے۔ہمیں۔دِينًا قِيَمًا ۔اور۔ٱلْإِسْلَٰمُ۔کے مابین تعلق کے متعلق بھی بتایاہے:

إِنَّ ٱلدِّينَ عِندَ ٱللَّهِ ٱلْإِسْلَٰمُ

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حیات وکائنات کیلئے وضع اور مقرر کردہ دستور اور نظام صرف اسلام ہے۔(حوالہ ءالِ عمران۔۱۹)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو وقار ومرتبہ کے لحاظ سے،اور ہمیں شرف بخشتے ہوئے، ہمارے جدامجد قرار دیاہے:

وَجَٰهِدُوا۟ فِى ٱللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِۦ

اوراے مدعیان ایمان !اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ راستے کے دفاع اور ان کی رضاومنظوری پانے کے لئے ایسے جانی،مالی اور فکری محنت و کوشش،جدوجہد کروجیساکہ اُن کیلئے کوشش کرنے کا حق/بتایاگیاطریقہ ہے(مکمل خلوص،ڈسپلن اور نظم وضبط،استقلال اور حکمت سے)۔

هُوَ ٱجْتَبَىٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى ٱلدِّينِ مِنْ حَرَجٍ

ان جناب نے تمام پر فوقیت دیتے ہوئے تم لوگوں کو منتخب فرمایاہے۔اور آئین اور ضابطہ حیات کے مندرجات میں قطعاًایسی بات کو تم لوگوں پر واجبِ تعمیل قرار نہیں دیا جو باعث پشیمانی،تکلیف اور تنگی ہو۔

مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَٰهِيمَ

تم لوگ مکمل داخل رہواپنے جدامجد ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت میں۔

هُوَ سَمَّىٰكُمُ ٱلْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِى هَٰذَا

انہوں(ابراہیم علیہ السلام)نے زمانہ قبل میں تم لوگوں کا نام مسلمان رکھاتھا۔اور اس(قرءان مجید)میں بھی تمہاری شناخت و پہچان یہی ہے۔

لِيَكُونَ ٱلرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ

اس کا مقصد تمہیں یہ فضیلت دیناہے کہ تمہارے اوپر گواہی دینے والے صرف رسولِ کریم(ﷺ)ہوں اور تم دوسرے لوگوں پر گواہی دینے والے بن جاؤ۔

فَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ

چونکہ دین قیّم کا یہ تقاضہ ہے اس لئے تم لوگ استقلال واستقامت،منظم طریقے سے تم لوگ صلوۃ کی ادائیگی کرتے رہو۔اور معاشرے کے نظم ونسق اور معاشی اٹھان کے لئے مالی تعاون،زکوۃ کی ادائیگی کرتے رہو۔

وَٱعْتَصِمُوا۟ بِٱللَّهِ هُوَ مَوْلَىٰكُمْ

اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تم لوگ اخلاص سے مرجع خلائق کا تعلق استوار رکھو۔وہ جناب تم لوگوں کے کارساز،حمائتی اور محافظ ہیں۔

فَنِعۡمَ ٱلۡمَوۡلَىٰ وَنِعۡمَ ٱلنَّصِيرُ ٧٨

چونکہ وہ مطلق غالب ہیں اس لئے کیا کمال کے کارساز، حمائتی اور محافظ ہیں وہ جناب اور کیا کمال کے ہمیشہ مدد بہم پہنچانے والے ہیں۔(الحج۔۷۸)

صِرَٰطٌ مُّسۡتَقِيمٌ.:اس کے متعلق مزید بتایا:

قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغۡوَيۡتَنِى

اس(ابلیس) نے کہا"میرے رب! آپ جناب نے چونکہ مجھے اس بشر کے سبب برباد کر دیا ہے،

لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمۡ فِى ٱلۡأَرۡضِ وَلَأُغۡوِيَنَّهُمۡ أَجۡمَعِينَ ٣٩

میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کے لئے بے راہروی، حبِ شہوات کو پرکشش زیبائش بناؤں گا، اور قسمیہ کہتا ہوں مستقبل میں ان کو میں رشد وراست سے بہکا کر کج روی پر مائل کر کے برباد کر دوں گا۔ اجتماعی طور پر۔

إِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ ٱلۡمُخۡلَصِينَ ٤٠

سوائے آپ کے بندوں میں اُن کے جو اِس حال میں ہیں کہ انہیں خصوصاً منتخب کیا گیا ہے(انبیاء علیہم السلام)اور وہ جنہوں نے اپنے آپ کو پیکر اخلاص میں ڈھال لیا ہو گا۔"(الحجر۔۴۰)

اللہ تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

قَالَ هَٰذَا صِرَٰطٌ عَلَىَّ مُسۡتَقِيمٌ ٤١

ان جناب نے فرمایا"پیکر اخلاص بننا ہی وہ راستہ/طریقہ ہے جو تسلسل سے سیدھا میری جانب رواں دواں رکھتا ہے،(الحجر۔۴۱)

إِنَّ عِبَادِى لَيۡسَ لَكَ عَلَيۡهِمۡ سُلۡطَٰنٌ

اس حقیقت کو تو(ابلیس) سمجھ لے، میرے بندوں کے متعلق۔۔کوئی اختیار، مختار نامہ، سند کا اظہار کرنا تیرے لئے کبھی ممکن نہیں ہو گا کہ تیرا ان پر تسلط ہے۔

إِلَّا مَنِ ٱتَّبَعَكَ مِنَ ٱلۡغَاوِينَ ٤٢

تیرے بہکاوے صرف اس پر کارگر ہوں گے جس نے، ان میں سے ہوتے ہوئے جو کسی موقع پر از خود بھٹکے طرز حیات پر کاربند ہیں، زیر مقصد تیری پیروی کی"۔

اس نکتے پر توجہ رہے کہ ابلیس نے اپنی قسم سے اللہ تعالیٰ کے جن بندوں کو مستثنیٰ کہا تھا ان کے لئے. ٱلۡمُخۡلَصِينَ.اسم مفعول استعمال کیا جس کے معنی ایسے بندے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے خصوصاً منتخب فرمایا، اور ایسے لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو پیکر اخلاص بنا لیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے کلام کی پہلی سورۃ کو انہماک اور غور سے پڑھا تو احساس ہوا کہ حقیقت میں اللہ رب العزت کو اُن کے بھیجے ہوئے پیغام کا نچوڑ/لب لباب/مقصد ہم سنا رہے ہیں اور اُنہیں گواہ بنا رہے ہیں کہ آقائے نامدار، رسولِ کریم ﷺ نے کمال احسن طریقے سے پیغام کو ہمیں پہنچایا اور تعلیم دی ہے۔اب زمان کے آخر تک آپ ﷺ داعی ہیں جو لوگوں کو اس راستے کی جانب آنے کی دعوت دے رہے ہیں جو انہیں سرخرو کر کے ان کے رب کے حضور پہنچائے گا۔

وَٱلۡقُرۡءَانِ ٱلۡحَكِيمِ ٢

اور قسم ہے قرءان کی، جس کی خصوصیت ہے کہ پنہاں کو عیاں کرتا بصیرت افروز ہے۔

إِنَّكَ لَمِنَ ٱلۡمُرۡسَلِينَ ٣

مقصود یہ طشت از بام کرنا ہے کہ یقیناً آپ (ﷺ) یقیناً آخری اور عالمی ہیں ان میں جنہیں بحثیت رسول (مختلف اقوام میں) بھیجا گیا تھا۔

عَلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ٤

اور دوسرا مقصد یہ تصدیق کرنا ہے کہ آپ (ﷺ) یقیناً ہمیشہ سے اُس راستے پر گامزن تھے جس کی جانب آنے کا لوگوں کو پیغام اور دعوت دے رہے ہیں جو کامیابی و کامرانی کی منزل کی جانب رواں دواں رکھتا ہے۔ (یٰسٓ۔ ۴)

تصدیق و تصدیق کے انداز بلاغت سے اس حقیقت کی دوبارہ نشاندہی فرمائی:

فَٱسۡتَمۡسِكۡ بِٱلَّذِيٓ أُوحِيَ إِلَيۡكَۖ

ان کے اپنے پاس سے اور غیر قرءان باتیں بتانے کے مطالبہ سے نہ کوفت محسوس کریں نہ اسے درخور اعتنا سمجھیں؛ اس لئے آپ (ﷺ) لوگوں کو ہدایت دینے کیلئے حسب معمول (حوالہ یونسؑ۔ ۵۱) اپنے آپ کو اِس ایک (قرءانِ مجید) تک محدود اور پابند رکھنے کی خواہش اور ارادے پر بدستور رہیں جو آپ (ﷺ) کی طرف بذریعہ کلام (وحی) بھیجا گیا ہے۔

إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ٤٣

آپ کے متعلق یہ حقیقت ہے کہ آپ (ﷺ) یقیناً ہمیشہ سے اُس راستے پر گامزن ہیں جس کی جانب آنے کا لوگوں کو پیغام اور دعوت دے رہے ہیں جو کامیابی و کامرانی کی منزل کی جانب رواں دواں رکھتا ہے۔ جو کامیابی و کامرانی کی منزل کی جانب رواں دواں رکھتا ہے۔ (الزخرف۔ ۴۳)

آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ نے اختصار سے بتادیا کہ ہمارے لئے -صِرَٰطٌ مُّسۡتَقِيمٌ. کیا ہے:

وَإِنَّهُۥ لَعِلۡمٞ لِّلسَّاعَةِ

آپ (ﷺ) سمجھائیں "اِس حقیقت کو جان لو کہ مخصوص ساعت کے وقوع پذیر ہونے کے متعلق علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس راز ہے۔ (سورۃ الاعراف کی آیت 187؛ العنکبوت کی 34؛ الحزاب 63؛ فصلت 47 اور الزخرف کی آیت 85 کے ساتھ پڑھیں)

فَلَا تَمۡتَرُنَّ بِهَا

چونکہ مجھے اس ساعت کے ظہور پذیر ہونے کے زمانہ اور تاریخ سے مطلع نہیں کیا گیا اس لئے تم لوگوں کو آئندہ اُس کے متعلق متردد نہیں ہونا چاہئے۔

وَٱتَّبِعُونِۚ

اور تم لوگوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ میری (رسول کریم) اتباع، پیروی کرو اس انداز میں کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی اور حائل نہ ہو۔

هَٰذَا صِرَٰطٞ مُّسۡتَقِيمٞ ٦١

یہ (میری اتباع کرنا) وہ طرز عمل/راستہ ہے جو کامیابی و کامرانی کی منزل کی جانب گامزن رکھتا ہے۔ (الزخرف۔ ۶۱)

ٱتَّبِعُونِ۔ جملہ فعلیہ، فعل امر؛ ضمیر جمع مذکر حاضر؛ نون الوقایہ جس پر حرف علت "زیر" ضمیر متکلم، واحد مذکر (ی) کے محذوف ہونے کا اظہار ہے۔ متکلم رسول کریم ﷺ ہیں۔ اتباع کے مادہ "ت ب ع" میں سمو یا بنیادی تصور اور معنی پیچھے پیچھے چلنا، نقش قدم (follow) پر اس انداز میں چلنا ہے کہ دونوں کے مابین کوئی تیسرا حائل نہ

ہو۔اتباع،اطاعت یعنی قول کو ماننے کے بعد کا مرحلہ ہے۔اتباع رسولِ کریم ﷺ کی ہے۔اتباع اُس ہدایت کی ہے جب قول کے ذریعے دے دی جائے۔رسول کریم ﷺ کی اطاعت،اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے کیونکہ قول رسولِ کریم ﷺ وہ ہے جو کلام اللہ ہے،اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قرءانِ مجید۔اور اتباع اللہ تعالیٰ کی ہدایت،قرءانِ مجید کی آیات کی ہے۔اطاعت کے بغیر اتباع نہیں کیونکہ پھر وہ اتباع نہیں ریاء کاری،دکھاوا ہے جیسے منافقین کے اعمال۔**اطاعت قول کو تسلیم کرنا ہے اور اتباع اس تسلیم کئے گئے قول کو عملی جامہ پہناتا ہے، عمل میں ڈھالتا ہے۔اس پر چلتا ہے۔ نقش قدم پر آگے بڑھتا ہے۔** صراط مستقیم پر قدم بہ قدم چلتے ہوئے منزل پر پہنچنا ہے۔
اتباع ہمیشہ نقوش کی ہے،ظاہری علامت،نشان کی ہے،ہدایت،راستے (سبیل) کی ہے۔اتباع میں عمل اور حرکت لازمی عنصر ہے۔ **اتباع، اطاعت یعنی قول کو تسلیم کرتے اور اس پر ایمان لاتے کا عملی مظاہرہ اور ثبوت ہے۔**

اتباع کے معنی متبوع (جس کی پیروی کی جائے؛سردار،پیشوا) کی اس انداز میں پیروی ہے کہ ان کے اور مُتَّبِع کے مابین تیسرا حائل نہ ہو۔عربی زبان میں تبیع گائے کے نوزائیدہ بچھڑے کو کہتے ہیں جو ماں کے بالکل ساتھ پیچھے چلتا ہے۔اس میں محافظت میں ہونے کا عنصر شامل ہے۔اس لئے تنبیہ فرمائی:

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ ٱلشَّيۡطَٰنُۖ

اور متنبہ رہو؛ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ شیطان تم لوگوں کو مستقبل میں اس (صراط مستقیم) سے ہٹا،منحرف کردے۔(کیونکہ اس پر بیٹھ کر دلفریب باتوں سے تمہیں اس سے منحرف کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا ہے۔(الاعراف۔١٦)

إِنَّهُۥ لَكُمۡ عَدُوّٞ مُّبِينٞ ٦٢

یقیناوہ تم لوگوں کے لئے اعلانیہ دشمن ہے"۔(الزخرف۔٦٢)

آقائے نامدار،رسول کریم ﷺ کی اتباع.صِرَٰطٞ مُّسۡتَقِيمٞ.ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت پانے کی شرط بھی:

قُلۡ إِن كُنتُمۡ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ

آپ (ﷺ مدعیان ایمان کو) واضح فرمادیں"اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے لگن اور تعلق خاطر چاہتے رہے ہو۔

فَٱتَّبِعُونِي

تو اس کے حصول کے لئے تم لوگ صدق دل سے اس انداز میں میری پیروی کرو کہ میرے اور تمہارے درمیان تیسرا حائل نہ ہو۔

يُحۡبِبۡكُمُ ٱللَّهُ

ایسا کرنے پر اللہ تعالیٰ تم سے لگن اور تعلق خاطر فرمائیں گے۔

وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوبَكُمۡۗ

اور وہ جناب تمہارا یہ طرز عمل اختیار کرنے پر تم لوگوں کی خاطر تمہارے ان حرائم/مجرمانہ الزام تراشیوں سے جو تم کر چکے ہو پردہ پوشی فرماتے ہوئے معاف فرمادیں گے۔

وَٱللَّهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ٣١

اور اللہ تعالیٰ کے متعلق یقین رکھو کہ درگزر اور پردہ پوشی کرنے اور اکثر و بیشتر معاف فرمانے والے ہیں،منبع رحمت ہیں"۔(ءال عمران۔٣١)

اس طرح-صِرَٰطٞ مُّسۡتَقِيمٞ=ٱعۡبُدُونِي "تم لوگ میری بااظہار بندگی کرو "=ٱلۡإِسۡلَٰمُ۔متعین کردہ آئین اور ضابطہ حیات=دِينٗا قِيَمٗا =مِّلَّةَ

---

۔ترجمہ آیت۔۷

صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ

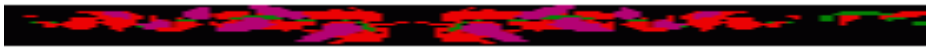

یہ راستہ اُن لوگوں کے سفرِ منزل کا ہے جنہیں آپ جناب نے خلعت کامرانی سے سرفراز فرما کر منعم بنادیا ہے۔

آیت مبارکہ کے الفاظ کی صرف و نحو و معنوی تحلیل (ویڈیو)

غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ

یہ اُن لوگوں کے اختیار کردہ راستے سے متمیز اور الگ ہے جن پر فردِ جرم کی گرفت ہو چکی ہے۔

وَلَا ٱلضَّآلِّينَ ۷

اور اُن سے بھی مختلف جو منحرف، کج رو، دانستہ غافل، اپنے آپ میں مگن ہیں۔(۷)

---

تحلیل۔تشریح معنوی و مفہوم، بلاغت

یہ آیت۔٦ کا ذیلی جملہ تفسیری، بیانیہ ہے جس میں متکلم اپنے صراط مستقیم کے متعلق تصور کی وضاحت کرتا ہے۔

صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ۔مرکب اضافی ہے۔دوسرا اسم چونکہ معرفہ ہے اس لئے پہلا اسم بھی اضافت کی وجہ سے (ٱلصِّرَٰطَ) معرفہ ہے،اور پچھلے اسم کا مکمل بدل "كلٌّ مِن كُل" ہے۔اسم موصول (ٱلَّذِينَ) جمع مذکر، حالت جر میں مضاف الیہ ہے۔یہ مرکب اضافی ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

ضمائر الوصل جملے میں تسلسل اور اس کی اکائیوں کے مابین اجتماع، اتصال کا کردار ادا کرتے ہیں۔یہ جملے میں استعمال ہوئے اسم اور فعل میں موجود ضمیر کو واضح اور متبین کرتے ہیں اپنے صلہ سے۔صلہ ذیلی جملہ ہے۔اس طرح ذیلی شق کے اضافے سے یہ جملے کی ساخت کو "مخلوط۔مربوط (complex sentence) بنادیتے ہیں ۔اسم الموصول کی جنس، تعداد اور اعرابی حالت اس **معرفہ** اسم کے مطابق ہوگی جس کا یہ حوالہ دیتا اور متبین کرتا ہے۔

متعلقہ اسم موصول دو خیالات کے مابین ایک پل/رابطے کے طور سوچا جاسکتا ہے۔گرائمر کے لحاظ سے، اس کا مقصد دوسرے اظہار کو معنی میں پہلے اظہار سے نسبت بتانا ہے۔دوسرے جملے/اظہار میں ایک ضمیر کا موجود ہونا ضروری ہے جو پہلے جملے سے مراد ہے۔اس ضمیر کو "عائد" کہتے ہیں اور یہ پہلے جملے سے تعلق بنتا ہے۔**ان کا استعمال گفتگو میں جامعیت اور زور، اصرار (emphasis) پیدا کرتا ہے۔**

أَنۡعَمۡتَ ۔جملہ فعلیہ صلۃالموصول۔فعل ماضی، ضمیر "تَ" واحد مذکر حاضر، مخاطب کے اتصال کی بناء پر ساکن ہے، باب افعال (Form-IV)، مصدر "انعَامٌ"۔ فعل متعدی ہے مگر مفعول محذوف ہے۔جملہ صلۃالموصول کا نحوی کردار نہیں ہوتا۔

عَلَيۡهِمۡ۔جار و مجرور متعلق فعل؛حرف جر.إستعلانية مجازية۔ ضمیر متصل جمع مذکر غائب راجع اسم موصول۔

غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ۔مرکب اضافی؛بدل اسم موصول۔اسم :مجرور-واحد مذکر مضاف؛یہ ہمیشہ مرکب میں استعمال ہوتا ہے،ماخذ"غ ی ر"اسم مفعول معرفہ باللام مجرور-جمع-مذکر۔مضاف الیہ۔ماخذ"غ ض ب"۔

عَلَيۡهِمۡ۔جار و مجرور متعلق اسم مفعول؛حرف جر.إستعلانية مجازية۔ ضمیر متصل جمع مذکر غائب راجع اسم موصول۔

وَلَا ٱلضَّآلِّينَ۔حرف عطف؛حرف نفی تاکید کے لئے؛ اسم مفعول معرفہ باللام مجرور-جمع-مذکر ۔معطوف بجانب ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ۔ماخذ"ض ل ل"

---

صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ

یہ راستہ اُن لوگوں کے سفرِ منزل کا ہے جنہیں آپ جناب نے خلعت کامرانی سے سرفراز فرما کر منعَم بنادیا ہے۔

آیت مبارکہ کے الفاظ کی صرف ونحو ومعنوی تحلیل (ویڈیو)

یہ جملہ فعلیہ۔أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ۔ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے۔مگر یہ فعل پانچ مرتبہ آیا ہے،چار مرتبہ مخاطب اللہ تعالیٰ ہیں اور ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ۔ فعل متعدی ہے مگر یہاں مفعول محذوف ہے۔باب افعال میں فاعل کا مفعول کو معنی مصدری اور ماخذ سے متصف کردینے کا مفہوم شامل ہے۔انعام یافتہ، منعَم بنادینا۔چونکہ مفعول محذوف ہے اس لئے جو انعام دیا گیا وہ کسی ایک نعمت تک محدود نہیں بلکہ وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔**انعام ہمیشہ کارکردگی(performance) پر دیا جاتا ہے جو انعام یافتہ کو سرفراز کرتا ہے۔**

جملہ۔أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ۔کو دوسری ترکیب میں یوں۔أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِمۡ۔دوبار بیان کیا گیا ہے۔

وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ

باخبر رہو؛جو شخص اللہ تعالیٰ اور رسول کریم (ﷺ) کے قول (قرءان مجید) کو صدق دل سے تسلیم کرتا ہے۔

فَأُوْلَٰٓئِكَ مَعَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِم

تو اس کے صلے میں ان لوگوں کو آخرت میں صحبت میسر آئے گی اُن ہستیوں کی جنہیں اللہ تعالیٰ نے خلعت کامرانی سے سرفراز فرمایا ہے

مِّنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ وَٱلصِّدِّيقِينَ وَٱلشُّهَدَآءِ وَٱلصَّٰلِحِينَۚ

ان تمام کی حیثیت اور شمار اللہ تعالیٰ کے از خود سے منتخب فرمائے اور تمام پر اشرف اور محترم قرار پائے بندوں میں ہے؛اور صدِّیقین (جنہوں نے قول و فعل سے اپنے اخلاصِ ایمان کو سچ ثابت کر دکھایا)،اور شہداء (شہادت/بطور گواہ مقرر کر دیئے گئے لوگ) اور صالحین (اعمال صالح پر کاربند لوگ)۔

وَحَسُنَ أُوْلَٰٓئِكَ رَفِيقًا ٦٩

اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول کریم (محمد ﷺ) کے فرمان کو تسلیم کرکے عمدہ ترین انتخاب کیا ہے،رفاقت کے حوالے سے۔(النساء۔٦٩)

---

أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمَ ٱللَّهُ عَلَيۡهِم مِّنَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ

یہ نام لے کر بیان کردہ ہستیاں وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے خلعت کامرانی سے سرفراز فرمایا ہے؛ان تمام کی حیثیت اور شمار اللہ تعالیٰ کے ازخود سے منتخب فرمائے اور تمام پر اشرف اور محترم قرار پائے بندوں میں تھا۔

مِن ذُرِّيَّةِ ءَادَمَ وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوحٖ

ان میں سے بعض کا شجرہ نسب ءادم کی ذریت میں تھا اور ان میں بعض کا تعلق ان اشخاص کی ذریت سے تھا جنہیں ہم جناب نے نوح علیہ السلام کے ساتھ سوار کیا تھا۔

وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبۡرَٰهِيمَ وَإِسۡرَٰٓءِيلَ

اور ان میں بعض کا شجرہ نسب ابراہیم (علیہ السلام) اور بعض کا اسرائیل (علیہ السلام) سے تھا۔

وَمِمَّنۡ هَدَيۡنَا وَٱجۡتَبَيۡنَآۚ

اور ان میں سے بعض کا تعلق ذریت ان سے تھا جنہیں ہم جناب نے ہدایت سے نوازا اور فوقیت دیتے ہوئے انہیں منتخب فرمایا تھا۔

إِذَا تُتۡلَىٰ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتُ ٱلرَّحۡمَٰنِ خَرُّواْ سُجَّدٗا وَبُكِيّٗا ۩ ٥٨

جب الرّحمن (ذوالجلال والاکرام) کی آیات انہیں سنائی جاتی تھیں تو وہ ان کے حضور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ ازخود سجدہ ریز ہو جاتے تھے۔(مریم۔۵۸)

[آیت سجدہ]

اللہ تعالیٰ کے کلام کے ابتدائی حصے کو بیان کر کے ہم نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کے فرمان یعنی قرءانِ مجید کو ہم نے صدقِ دل سے قبول کر لیا ہے۔اور اظہار بندگی کرنے کے بعد اپنے آپ کو صراط مستقیم پر گامزن رکھنے کے لئے ہر لمحہ ہدایت کے طلبگار ہیں کہ **یہ راستہ ان لوگوں کے سفر منزل کا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے سند افتخار اور کامرانی عطا فرمادی ہے۔**

غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ

یہ اُن لوگوں کے اختیار کردہ راستے سے متمیز اور الگ ہے جن پر فرد جرم کی گرفت ہو چکی ہے۔

اسم موصول کو بدل کر۔صِرَٰطَ۔سے اس کا الصاق کر کے منفی طرز فکر و عمل کے لوگوں کے راہ سفر سے صراط مستقیم کو متمیز کیا ہے کہ یہ راستہ ان لوگوں کے اختیار کردہ راستے سے مختلف ہے۔اللہ تعالیٰ کے کلام میں۔**ٱلۡمَغۡضُوبِ۔اسم مفعول فقط ایک مرتبہ** آیا ہے۔کیوں؟اس میں منطق (logic) کیا ہے؟اس لئے کہ جو شخص ''مغضوب'' قرار دے دیا گیا تو وہ دائمی طور پر حیات دنیا اور آخرت میں اِس حالت میں رہے گا۔حیات دنیا میں اُس کے لئے خیر، ایمان لانے کی جانب پلٹنے کے تمام دروازے بند ہو گئے۔یہ وہ شخص ہے جس کے قلب پر خود سے ڈالے غلاف، زنگ کی دبیز تہہ کو اللہ تعالیٰ نے سر بمہر کر دیا ہے (حوالہ البقرۃ۔٦)۔

اس کا ماخذ'' غ ض ب'' ہے۔ابن فارس نے بنیادی معنی قوت و شدت بتائے ہیں۔سرخ یا ہر گہرے سرخ رنگ کی چیز؛اور چونکہ غصے کی حالت میں انسان کے چہرے کی رنگت سرخ ہو جاتی ہے، جو بنیادی طور پر شدت و قوت اور حرارت کی علامت ہے، اِس لئے مخلوقات کے حوالے سے غضب اُس حالت کو کہتے ہیں جب غصے میں یعنی شدت و قوت و حرارت کی گرفت میں وہ ہوں۔

غصہ (wrath) کے متعلق عام فہم ادراک یہ ہے کہ محبت اور خوف کی مانند ایک گہرا/بڑھا ہوا احساس (hightened feeling) ہے اور جذبات (emotion) میں شمار ہوتا ہے۔جذبات انسان کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتے ہیں اور حاوی ہونے والی شئے کی گرفت/غلبے میں وہ شئے ہوتی ہے جس پر وہ چھا گئی ہے۔

اور علم نفسیات میں غصہ رد عمل کا مظہر ہے جو ذی حیات کے جسم کے نظام میں بعض تغیر و تبدل سے منسلک ہے، جیسے دل کی دھڑکن، نبض کی رفتار(pulse rate)اور جسمانی حرارت(body temperature)کا بڑھنا۔اِس فوری رد عمل کا محرک(stimuli)خارج سے ہو سکتا ہے اور بعض اوقات یاداشت میں محفوظ باتوں کا تجزیہ کرنے سے انسان اِس احساس کی گرفت میں آسکتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کیلئے خارج سے کونسی بات انہیں گرفت میں لینے کا سبب بنی تھی؟

وَمَآ أَعۡجَلَكَ عَن قَوۡمِكَ يَٰمُوسَىٰ ٨٣

اللہ تعالیٰ نے پوچھا"اور کیا وجہ ہے جس نے آپ کو اپنی قوم کو چھوڑ کر یہاں عجلت میں آنے پر راغب کیا؟اے موسیٰ(علیہ السلام)؟"

قَالَ هُمۡ أُوْلَآءِ عَلَىٰٓ أَثَرِي

انہوں(موسیٰ علیہ السلام)نے عرض کیا"وہ میرے بتائے ہوئے طرز عمل پر عمل پیرا ہیں۔

وَعَجِلۡتُ إِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضَىٰ ٨٤

اس حالت کے پیش نظر میں نے آپ کی جانب آنے میں جلدی کی،اے میرے رب!اس خواہش کے زیر اثر کہ آپ جناب کی رضا پاؤں"۔(طٰہٰ۔۸۴)

موسیٰ علیہ السلام نے اعتماد سے کہا کہ قوم کو پیچھے چھوڑ آنے اور مقررہ وقت سے جلدی پہنچنے کی وجہ یہ ہے کہ قوم اُن کی پیروی کرتے ہوئے راہ راست پر ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے اعتماد اور یقین کو اس لمحے سخت دھچکا لگا جب انہیں یہ بتایا گیا:

قَالَ فَإِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۢ بَعۡدِكَ

انہوں نے بتایا"آپ کی بات صحیح ہے مگر آپ کے چلے آنے کے بعد ہم جناب نے آپ کی قوم کو آزمائش میں مبتلا رہنے دیا ہے۔

وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِيُّ ٨٥

اس حال میں کہ سامری انہیں منحرف اور گمراہ کر چکا تھا"(طٰہٰ۔۸۵)

انسان کا کسی پر اعتماد،یقین اور بھروسہ جب مجروح ہو تو ایک ایسے احساس کی گرفت میں آجاتا ہے جس میں شدت و قوت،تاسف کا رنگ لئے ہوتی ہے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰٓ إِلَىٰ قَوۡمِهِۦ غَضۡبَٰنَ أَسِفٗا

اور قوم کے گمراہ کئے جانے کی اطلاع پاکر جوں ہی موسیٰ(علیہ السلام)احساس افسوس سے غصے سے مغلوب اپنی قوم کی طرف لوٹے تھے۔(حوالہ الاعراف۔۱۵۰)

---

فَرَجَعَ مُوسَىٰٓ إِلَىٰ قَوۡمِهِۦ غَضۡبَٰنَ أَسِفٗاۚ

قوم کے گمراہ کئے جانے کی اطلاع پاکر موسیٰ(علیہ السلام)احساس افسوس سے غصے سے مغلوب اپنی قوم کی طرف لوٹے۔(حوالہ طٰہٰ۔۸۶)

"أَسِفًا"میں بھی شدت و قوت کا مفہوم مضمر ہے۔کسی شئے کے کھو جانے پر شدید احساسِ افسوس۔غصے میں حرارت بڑھ جاتی ہے اور حرارت رکنے والی شئے نہیں ہے بلکہ خارج(emit, radiate)ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَى ٱلۡغَضَبُ أَخَذَ ٱلۡأَلۡوَاحَ ۖ

اور جوں ہی غصہ موسیٰ (علیہ السلام) سے سکوت میں ہوا، انہوں نے تختیوں کو اٹھالیا۔

وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿١٥٤﴾

جان لو؛ راست روی کے راستے پر گامزن رہنے کے لئے ہدایت اُن پر کندہ منذر جات کا اہم جزو تھا۔ اور رحمت کے نزول کا وعدہ ان لوگوں کے لئے کندہ تھا جو اپنے رب کے مقام و مرتبہ کا ادراک رکھتے ہوئے مرعوب اور سہمے سہمے رہتے ہیں۔ (الاعراف۔ ۱۵۴)

''سَكَتَ'' ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب۔ ''وہ تھم گیا، سکوت میں ہو گیا، اُس نے خاموشی اختیار کی''۔ اِس کے بنیادی معنی خاموش ہونا ہیں اور خاموشی سکوت کو طاری کرتی ہے جب کہ بولنا ہوا کی لہروں میں ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ اور غصہ جب تھمتا ہے تو در حقیقت ارتعاش سے حالت سکوت میں جانا ہے کہ شئے جب ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو اُس سے حرارت کی لہریں فضا میں ارتعاش پیدا نہیں کرتیں۔ قرءانِ مبین کے الفاظ مادی حقیقتوں کو سموئے ہوئے ہیں۔

وَٱلَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَٰٓئِرَ ٱلْإِثْمِ وَٱلْفَوَٰحِشَ

اور یہ (صدق قلب سے ایمان لانے والے) وہ لوگ ہیں جو کوشش و اخلاص سے بڑے گناہوں سے اجتناب کرتے رہتے ہیں، اور اسی طرح فحش، جنسی بے راہ روی سے اجتناب کرتے ہیں۔

وَإِذَا مَا غَضِبُواْ هُمْ يَغْفِرُونَ ﴿٣٧﴾

اور جب انہیں جس نے غضبناک (غصہ دلایا/غصے میں) کیا تو وہ در گزر اور معاف کر دیتے ہیں۔ (الشوریٰ۔ ۳۷)

اردو کا لفظ ''غصہ'' چونکہ احساس اور جذبات سے تعلق رکھتا ہے اس لئے بعض مترجمین اور مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے حوالے سے عربی لفظ ''غَضَب'' کو ہی اردو ترجمے میں اختیار کیا جب کہ بعض نے اس کا ترجمہ ''غصہ'' ہی کیا۔ مگر دونوں میں فرق نہیں کہ اردو ڈکشنری میں غضب کے معنی غصہ، قہر ہی ہیں۔ جس مجرم کے متعلق اُس کے جرم کے شواہد اور ثبوت مل چکے ہوں وہ مقتدر اعلیٰ کی جانب سے گرفت میں لئے جانے ''غَضَب'' کا مستحق ہو جاتا ہے جس کے بعد اُسے اُس کے جرم کی سزا دی جاتی ہے۔ سزا دینے کیلئے پہلا مرحلہ مجرم کو گرفت میں لینا/ گرفتار کرنا ہے وہ تمام لوگ جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے گرفت میں لئے جانے کے مستحق ہو گئے ہیں انہیں روز قیامت حیات بحال کئے جانے پر فوراً گرفتار کر لیا جائے گا اور ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی جائیں گی۔ اور اُس وقت اُن سے اُن کا جرم بھی نہیں پوچھا جائے گا کہ دنیا کی حیات کے دوران ہی انہیں مغضوب یعنی مستحقِ گرفت قرار دے دیا گیا تھا۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَن ذَنۢبِهِۦٓ إِنسٌ وَلَا جَآنٌّ ﴿٣٩﴾

بسبب آواز جس دن حیات کو بحال کیا جا چکا ہو گا تو اس دن نہ انسان سے اور نہ جنات سے کسی مجرم سے اس کے جرم کے متعلق (ملائکہ کی جانب سے) پوچھا جائے گا۔ (سورۃ الرحمٰن۔ ۳۹)

---

يُعْرَفُ ٱلْمُجْرِمُونَ بِسِيمَٰهُمْ

مجرمین اپنے چہرے کی علامتوں/تاثرات سے پہچان لئے جائیں گے۔

فَيُؤْخَذُ بِٱلنَّوَٰصِى وَٱلْأَقْدَامِ ﴿٤١﴾

شناخت کئے جانے پر انہیں پیشانی کے بالوں اور ٹانگوں سے پکڑ کر گرفتار کر لیا جائے گا۔ (سورۃ الرحمٰن۔ ۴۲)

فَبِأَىِّ ءَالَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٤٢﴾

اس لئے تم اپنے رب کے مجرمین کی پہچان کیلئے مقرر کی گئی کس کس انداز/علامت کو تم دونوں جھٹلا سکو گے ؟(سورۃ الرحمٰن۔۴۲)

''اَلْأَقْدَامِ''جمع اور واحد قَدَمٌ۔قدم، پاؤں۔ قابو کر کے انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔

وَتَرَى ٱلْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِى ٱلْأَصْفَادِ ﴿٤٩﴾

اور اس دن جب حیات نو پانے پر لوگ قبروں سے نکل چکے ہوں گے، آپ(ﷺ) مجرمین کو اس حال میں دیکھیں گے کہ زنجیروں میں اکھٹے جکڑے ہوئے ہیں۔(سورۃ ابراہیمؑ۔۴۹)

---

إِذِ ٱلْأَغْلَٰلُ فِىٓ أَعْنَاقِهِمْ وَٱلسَّلَٰسِلُ يُسْحَبُونَ ﴿٧١﴾

(وہ جلد انجام جان لیں گے)جب انہیں اس حال میں دھکیلا جائے گا کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے گئے ہوں گے اور انہیں زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہو گا۔(غافر۔۷۱)

---

خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ﴿٣٠﴾

(پولیس ڈیوٹی پر مامور ملائکہ کو حکم دیا جائے گا)''اسے پکڑ کر گرفت میں لے لو اور تم لوگ اسے طوق پہنا دو''۔(الحاقۃ۔۳۰)

---

إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكَٰفِرِينَ سَلَٰسِلَا۟ وَأَغْلَٰلًا وَسَعِيرًا ﴿٤﴾

یہ حقیقت ہے کہ ہم جناب نے حالت کفر میں مرنے والوں کے لئے زنجیریں اور گردن میں ڈالنے والے طوق اور گرم حرارت والا قید خانہ تیار کر رکھا ہے۔(الانسان۔۴)

---

اللہ تعالیٰ عادل ہیں؛عدل کرتے ہیں اور عدل مجرم کو قوت و طاقت سے سزا دینے کا طالب ہے۔اللہ تعالیٰ گرفت میں صرف اُسے لیتے ہیں جو اپنے آپ کو گرفتاری کا مستحق(بآءُو) ثابت کر دے۔اور جو شخص اپنے آپ کو مجرم ثابت/ظاہر کر دے اسے سزا دینا عادل مقتدر اعلیٰ پر واجب ہو جاتا ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو نظام ایسے دکھائی دے گا جیسے(arbitrary and whimsical, dictatorial)خواہشات کے زیر اثر صوابدیدی آمریت ہے۔

## بنی اسرائیل مغضوب/گرفت کی مستحق قوم ہے

اللہ تعالیٰ نے اہل یہود کی اکثریت کے جرائم کے متعلق تفصیلی فرد جرم بیان فرمائی ہے اور ان کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَٰحِدٍ

اور(اے بنی اسرائیل یاد کرو)جب تم لوگوں نے کہا تھا''اے موسیٰ(علیہ السلام)!ہم سے ایک ہی طرح کے طعام پر صبر نہیں ہوتا۔

فَٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنۢبِتُ ٱلْأَرْضُ

اِس لئے اپنے رب سے ہمارے لئے دعا کریں کہ ہمارے لئے وہ مہیا کرے جسے زمین اگاتی ہے

مِنۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ

اُس کی سبزیاں/ساگ،کھیرے ککڑی،اُس کا اناج/گیہوں،اُس کی مسور،اُس کی پیاز میں سے''۔

قَالَ أَتَسۡتَبۡدِلُونَ ٱلَّذِي هُوَ أَدۡنَىٰ بِٱلَّذِي هُوَ خَيۡرٌۚ

انہوں (موسیٰ علیہ السلام) نے کہا "کیا تم اُس طعام کو جو زیادہ بہتر ہے اُس شئے سے بدلنا چاہتے ہو جو نسبتاً ادنیٰ ہے؟

ٱهۡبِطُواْ مِصۡرٗا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلۡتُمۡۖ

(پہاڑی علاقے سے) نیچے/پستی کی جانب بستی میں اترو تو پھر تمہیں یقیناوہ سب ملے گا جس کا تم سوال کر رہے ہو"۔

وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ ٱلذِّلَّةُ وَٱلۡمَسۡكَنَةُ

جان لو ان کے متعلق یہ حقیقت۔اُن پر زیر سرپرستی رہنے، دوسروں پر انحصار کرنے اور سکونت کی محتاجی مسلط کر دی گئی ہے۔

وَبَآءُو بِغَضَبٖ مِّنَ ٱللَّهِۗ

اور انہوں نے اپنے آپ کو مجرمانہ جانکاری کے مستحق بنالیا ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے گرفت میں لئے جانے کے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ كَانُواْ يَكۡفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ

یہ فیصلہ اِس لئے ہوا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے انکار کو اپنی سرشت بنائے رکھا۔

وَيَقۡتُلُونَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ بِغَيۡرِ ٱلۡحَقِّۚ

اور اس بناء پر کہ وہ حقیقت کے منافی باتوں سے نبیوں کی کردار کشی، تحقیر و توہین کرتے اور انہیں زچ کرتے تھے۔

ذَٰلِكَ بِمَا عَصَواْ وَّكَانُواْ يَعۡتَدُونَ ٦١

آپ جان لیں، یہ اس وجہ سے کرتے تھے کہ انہوں نے اُن (نبیوں) کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور دوری اختیار کرتے/حد سے نکل جانے کی روش کو انہوں نے اپنائے رکھا۔(البقرۃ۔٦١)

---

ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ ٱلذِّلَّةُ أَيۡنَ مَا ثُقِفُوٓاْ إِلَّا بِحَبۡلٖ مِّنَ ٱللَّهِ وَحَبۡلٖ مِّنَ ٱلنَّاسِ

جان لو ان کے متعلق یہ حقیقت۔اُن پر زیر سرپرستی رہنے، دوسروں پر انحصار کرنے کی محتاجی مسلط کر دی گئی ہے جہاں کہیں انہیں رہنے کی جگہ ملی ہو، اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ "رسی" سے الصاق کریں یا لوگوں کی جانب سے سہارے کی رسی سے بندھ کر۔

وَبَآءُو بِغَضَبٖ مِّنَ ٱللَّهِ

اور انہوں نے اپنے آپ کو مجرمانہ جانکاری کے مستحق بنالیا ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے گرفت میں لئے جانے کے۔

وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ ٱلۡمَسۡكَنَةُۚ

جان لو اور ان پر سکونت کی محتاجی مسلط کر دی گئی ہے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ كَانُواْ يَكۡفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ

یہ فیصلہ اِس لئے ہوا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے انکار کو اپنی سرشت بنائے رکھا۔

وَيَقۡتُلُونَ ٱلۡأَنۢبِيَآءَ بِغَيۡرِ حَقّٖۚ

اوراس بناءپر کہ وہ حقیقت کے منافی باتوں سے چند نبیوں کی کردار کشی، تحقیر وتوہین کرتے اورانہیں زچ کرتے تھے۔

ذَٰلِكَ بِمَا عَصَواْ وَّ كَانُواْ يَعْتَدُونَ ﴿١١٢﴾

آپ جان لیں، یہ اس وجہ سے کرتے تھے کہ انہوں نے اُن (نبیوں) کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور دوری اختیار کرتے/حد سے نکل جانے کی روش کو انہوں نے اپنائے رکھا۔(ءالِ عمران۔۱۱۲)

---

بَآءُو: فعل ماضی جمع مذکر غائب کے مادہ ''ب وء'' کے بنیادی معنی کسی کی طرف لوٹنا، رجوع کرنا، موافق و مطابق ہو جانا ہیں۔اور حرم و سزا کے حوالے سے اپنے آپ کو موافق و مطابق بنانے کا مفہوم گرفت تک پہنچ جانا/ گرفتاری کا مستحق ہو جانا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے قوم سے عجلت میں جانے سے قبل انہیں سایہ، من و سلویٰ اور پانی مہیا کر دیئے جانے پر بنی اسرائیل کو کہا گیا تھا:

كُلُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ

کھاؤ اِن طیب (مرغوب اور خود کے لئے صحت افزا) چیزوں میں سے جو ہم جناب نے رزق تم لوگوں کو عطا کیا ہے۔

وَلَا تَطْغَوْاْ فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِى ۖ

اور تمہیں منع کیا جاتا ہے کہ اس معاملے میں طغیان مند بنو۔ایسا کرو گے تو میرا گرفت میں لینا تم لوگوں پر مستوجب ہو جائے گا۔

وَمَن يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِى فَقَدْ هَوَىٰ ﴿٨١﴾

متنبہ رہو؛ میرا گرفت میں لینا جس کسی پر مستوجب ہو گیا تو اس کا انجام سمجھو کہ وہ خالی دامن ہو چکا ہے۔(طہٰ۔۸۱)

فَيَحِلَّ۔ حرف ''ف'' انجام کو ظاہر کرتا ہے ما قبل ممانعت کی حکم عدولی پر۔+يَحِلَّ فعل واحد مذکر غائب مضارع منصوب۔اِس کا مادہ '' ح ل ل'' ہے جس کے بنیادی معنی/تصور گرہ کھولنے اور ٹھوس چیز کو پگھلا دینا یعنی مائع میں تبدیل کرنا ہے۔جس شئے کی گرہ کھول دی جائے وہ حلال ہو جاتی/کہلاتی ہے۔جن اشیاء کے کھانے پینے کی اجازت ہے انہیں حلال کہتے ہیں کہ جسم کا حصہ بننے سے قبل کھائی ہوئی شئے کو ''پگھلا'' کر مائع بنایا جاتا ہے۔اور ٹھوس شئے کے پگھلنے/مائع بننے کے عمل میں بھی در حقیقت ''گرہیں'' کھلتی ہیں۔کوئی بھی شئے، بات اور عمل حلال صرف اُس صورت میں کہلا سکتا ہے جب گرہ کھول دی جائے۔قرءانِ مجید کا ہر لفظ اپنے اندر لطیف معلومات سموئے ہوئے ہے۔

'' هَوَىٰ''، فعل ماضی، واحد مذکر غائب، ضمیر فاعل مستتر، راجع اس شخص کی جانب جس کو گرفت میں لینا واجب ہو چکا۔اس کا مادہ ''ھ وی'' ہے جس کے معنی کسی شئے کا اوپر سے نیچے گرنا، خالی اور کھوکھلی چیز کو کہتے ہیں بالخصوص زمین و آسمان کے درمیان خالی فضا خواہشات، جذبات و ہوس (lust) کی غلامی۔قرءانِ مجید نے اِس کے معنی اور مفہوم پست/سفلی/دنیاوی مفادات کی خواہشات اور تخیلاتی، ظن و گمان کی باتیں بتایا ہے جو انسان کے دل و دماغ پر چھائی/قابض ہوں جن سے علم و حقیقت چھپ کر رہ جائے۔اِس مادہ سے بنا لفظ انسان کو گرفت میں لینے کے انجام کے حوالے سے صرف ایک مرتبہ آیا ہے۔

''هَوَىٰ''ایک کیفیت اور حالت کو بیان کر رہا ہے اور اس کیفیت کے زیر اثر آنے کی وجہ انسان کیلئے اُس کا گرفت میں لئے جانا ہے۔''هَوَىٰ'' کے اِن معنی اور مفہوم کی روشنی میں اسلان کے ''هَوَىٰ'' ہونے کا مطلب ایک ایسی کھوکھلی خواہشات کی دنیا میں کھو جانے کیلئے دھتکار دیا جانا ہے جو ایسی تباہی و بربادی پر منتج ہو جس میں انسان نہ جیئے اور نہ مرے۔

بنی اسرائیل کو زمان میں متنبہ کیا جاتا رہا کہ اپنے طرز عمل کو درست کریں اس سے قبل کہ انہیں مغضوب قرار دے دیا جائے۔

فَرَجَعَ مُوسَىٰٓ إِلَىٰ قَوۡمِهِۦ غَضۡبَٰنَ أَسِفٗاۚ

قوم کے گمراہ کئے جانے کی اطلاع پاکر موسیٰ (علیہ السلام) احساس افسوس سے غصے سے مغلوب اپنی قوم کی طرف لوٹے۔

قَالَ يَٰقَوۡمِ أَلَمۡ يَعِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًاۚ

انہوں نے کہا: ''اے میری قوم! کیا تمہارے رب نے تم سے عمدہ وعدہ نہیں کیا؟

أَفَطَالَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡعَهۡدُ

کیا وعدے کی تکمیل میں وہ زمانہ تم لوگوں پر طویل ہو گیا ہے؟

أَمۡ أَرَدتُّمۡ أَن يَحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبٞ مِّن رَّبِّكُمۡ

یا کیا تم لوگوں کا ارادہ یہ تھا کہ تمہارے رب کی جانب سے تمہیں گرفت میں لینا واجب ہو جائے

فَأَخۡلَفۡتُم مَّوۡعِدِي ٨٦

جس کی وجہ سے تم نے میرے ساتھ کیئے وعدے کی خلاف ورزی کی؟'' (طٰہٰ۔۸۶)

قرءانِ مجید نے غیر مبہم انداز میں واضح فرمایا ہے کہ ''غضب''، ''لعنت'' اور ''عذاب'' ایک دوسرے سے الگ الگ معنی اور مفہوم کے حامل ہیں۔ گرفت میں لیا جانا عذاب دینے سے قبل ہوتا ہے تاکہ مجرم سزا سے بچنے کیلئے بھاگ/فرار نہ ہو سکے۔

مَن كَفَرَ بِٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ إِيمَٰنِهِۦٓ إِلَّا مَنۡ أُكۡرِهَ وَقَلۡبُهُۥ مُطۡمَئِنُّۢ بِٱلۡإِيمَٰنِ

متنبہ رہو؛ اگر کسی شخص نے اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کا انکار کر دیا اپنے ایمان لانے کے بعد کے دور میں تو اپنے آپ کو مجرم بنانے کی راہ پر چل پڑا؛ اس بات کا اطلاق اس شخص پر نہیں ہے جسے زبان سے اس انکار پر مجبور کر دیا گیا جبکہ اس کا قلب اپنے ایمان کی صداقت پر مطمئن تھا۔

وَلَٰكِن مَّن شَرَحَ بِٱلۡكُفۡرِ صَدۡرٗا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٞ مِّنَ ٱللَّهِ

لیکن اگر کسی نے اپنے سینے کو کفر کے لئے کھول دیا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے گرفت میں لیئے جانا ان پر صادر ہو جائے گا۔

وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٞ ١٠٦

جان لیں ایک عذاب جو ان کی ہڈیوں میں سرایت کرے گا اُن کیلئے تیار اور منتظر ہے (غذایت کی کمی)۔ (النحل۔۱۰۶)

---

وَٱلَّذِينَ يُحَآجُّونَ فِي ٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ مَا ٱسۡتُجِيبَ لَهُۥ

جان لو؛ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے متعلق باتوں کے پیچ و خم سے الجھتے اور بحث کرتے ہیں بعد اُس کے جس پر ان جناب کے لئے صدائے لبیک کو بلند کیا جا چکا ہے۔

حُجَّتُهُمۡ دَاحِضَةٌ عِندَ رَبِّهِمۡ

اُن لوگوں کی کٹ حجّتی ان کے رب کے نزدیک بے سر و پا پھسلاہٹ ہے۔

وَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٞ

اور بہ حیثیت مجرم گرفت میں لیئے جانے کا اللہ تعالیٰ کا فرمان ان پر صادر ہو گا۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿١٦﴾

اور ایک شدید محسوس ہونے والی جسمانی سزا ان کے لئے تیار اور منتظر ہے۔(الشوریٰ۔١٦)

---

وَيُعَذِّبَ ٱلْمُنَٰفِقِينَ وَٱلْمُنَٰفِقَٰتِ وَٱلْمُشْرِكِينَ وَٱلْمُشْرِكَٰتِ

اور اس فتح کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ جناب منافق مردوں اور منافق عورتوں اور رسول کریم کا انکار کرنے والے بت پرست مردوں اور عورتوں کو عذاب میں مبتلا کر دیں۔

ٱلظَّآنِّينَ بِٱللَّهِ ظَنَّ ٱلسَّوْءِ ۚ

اللہ تعالیٰ کے متعلق حقیقت کے منافی یہ لوگ گمان رکھنے والے ہیں۔ برائی پر مبنی گمان۔

عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ ٱلسَّوْءِ ۖ

برائی کا بھنور ان پر منڈلاتا رہتا ہے۔

وَغَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ

اور اللہ تعالیٰ نے ان پر گرفت کا فرمان جاری کر دیا ہے اور ان جناب نے انہیں ملعون/راندہ درگاہ، دھتکارے ہوئے قرار دے دیا ہے۔

وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۖ

اور ان جناب نے جہنم کو ان کے لئے ابدی رہائش گاہ کے طور تیار کر رکھا ہے۔

وَسَآءَتْ مَصِيرًا ﴿٦﴾

اور کیا ہی وہ بری منزل ہے رہائش پذیر ہونے کے لئے!(الفتح۔٦)

منافق کہلانے کیلئے بنیادی شرط یہ ہے کہ مومن/اسلامی معاشرے میں یہ جھوٹا دعویٰ کرے/بیان دے/حلف اٹھائے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور آقائے نامدار ﷺ کو خاتم النبیین مانتا ہے۔ اور قرءانِ مجید میں آخری مرتبہ لفظ ''غضب'' یہ بتانے کیلئے استعمال ہوا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟

اے وہ لوگوں جنہوں نے رسول کریم (محمّد ﷺ) اور قرءان مجید پر ایمان لانے کا اقرار و اعلان کیا ہے توجہ سے سنو!

لَا تَتَوَلَّوْا۟ قَوْمًا غَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ

تم کو اس قوم کی جانب از خود پلٹنے سے منع کیا جاتا ہے جس کے لوگوں کی اکثریت پر اللہ تعالیٰ نے گرفت کا فرمان جاری کر دیا ہے۔

قَدْ يَئِسُوا۟ مِنَ ٱلْءَاخِرَةِ

وہ (یہودیوں کی اکثریت) یقیناً آخرت میں کامیابی سے مایوس اور ناامید ہو چکے ہیں۔

كَمَا يَئِسَ ٱلْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْقُبُورِ ﴿١٣﴾

اس ناامیدی کا انداز ایسا ہی ہے جیسے کٹر کفار اہل قبور سے کسی قسم کی امید نہیں رکھتے۔(الممتحنہ۔١٣)۔

صدق قلب سے ایمان لانے والے صراط مستقیم کو مغضوب لوگوں کی راہ سے الگ قرار دیتے ہیں جس کے جواب میں کتابِ لاریب، قرءانِ عظیم ایسی قوم کی روش اور اختیار

کردہ راہ کی نشاندہی کرتا ہے جس کی بناء پر اُن کی اکثریت اللہ تعالیٰ کی جانب سے گرفت کی مستحق (مغضوب) قرار پائی ہے۔ گرفت میں آنا اِس بات کا مظہر ہے کہ مجرم ہونا ثابت ہو چکا جس کی بناء پر سزا لازماً ملے گی اور یہی وجہ ہے کہ مغضوب لوگ آخرت میں کسی بھی خیر ملنے سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور پھر اپنے آپ کو یوں طفل تسلیاں دیتے ہیں:

وَقَالُواْ لَن تَمَسَّنَا ٱلنَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعۡدُودَةً

اور لوگوں سے وہ کہتے ہیں ''ہمیں آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے دنوں کیلئے''۔

قُلۡ أَتَّخَذۡتُمۡ عِندَ ٱللَّهِ عَهۡدًا فَلَن يُخۡلِفَ ٱللَّهُ عَهۡدَهُۥٓ

اِن سے پوچھو ''کیا تم لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے اِس بات کا عہد لیا ہے؟ اگر ایسا ہے پھر تو اللہ تعالیٰ اپنے عہد کے خلاف نہیں کریں گے (کیونکہ کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتے)

أَمۡ تَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعۡلَمُونَ ٨٠

یا تم اللہ تعالیٰ سے وہ بات منسوب کر کے کہتے ہو جس کا تم لوگوں کو علم نہیں؟'' (البقرۃ۔ ۸۰)

انسان کی نفسیات عجیب ہے۔ اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے باز نہیں رہتا۔ جب اہلِ کتاب کو اختلافی باتوں اور روایات کے بارے میں فیصلے کیلئے قرءانِ مجید کی طرف بلایا جاتا ہے تو ان کا ایک فریق اس سے اعراض برتتا ہے اور اس بے اعتنائی کی وجہ یہ ہے:

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ قَالُواْ لَن تَمَسَّنَا ٱلنَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعۡدُودَٰتٍ

ان کا یہ رویہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا ہوا ہے ''ہمیں جہنم کی آگ / تپش نہیں چھوئے گی سوائے معدودے چند دنوں کے دوران''۔

وَغَرَّهُمۡ فِي دِينِهِم مَّا كَانُواْ يَفۡتَرُونَ ٢٤

متنبہ رہو! ان باتوں نے جو وہ زیرِ مقصد کاٹ چھانٹ کر اختراع کرتے رہے ہیں انہیں اپنے ضابطہ حیات / دین کے معاملات میں جھوٹی خوش فہمیوں سے فریب دینے میں مبتلا کر دیا ہے۔ (ءالِ عمران۔ ۲۴)

ان کی اس بات سے یہ اظہار ہوتا ہے کہ ایسے لوگ کسی اصول، کسی دلیل سے قرءان مجید کی بات کو رد نہیں کر رہے بلکہ اس سے اجتناب برتنے کیلئے ایک منفی نتیجے میں ایک مثبت پہلو اختراع کر کے دل کے نہاں خانے میں بسا کر اپنے آپ کو ذہنی طور پر دھوکہ دیتے ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ آگ ہمیں چھوئے گی مگر ایک طفل تسلی، ایک مثبت پہلو یہ گھڑ لیا کہ ایسا چند روز کیلئے ہوگا۔ یہ ایک عجیب نفسیاتی دھوکہ ہے جو انسان اپنے آپ کو دیتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اختراع کی ہوئی باتیں اس قدر گہری جڑیں پکڑ لیتی ہیں کہ اسے دین کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کے اس قول کہ 'جنت میں کوئی نہیں جائے گا سوائے اسکے جو یہودی ہو یا نصاریٰ' کو ''تِلۡكَ أَمَانِيُّهُمۡ'' ان کی آرزوئیں، خوش فہمیاں قرار دیا گیا ہے (حوالہ البقرۃ۔ ۱۱۱)۔ شیطان رجیم نے کہا تھا کہ وہ لوگوں کے قلب و ذہن میں ''آرزوئیں'' پیدا کرے گا (حوالہ النساء ۱۱۹۔ ۱۲۰) اس طرح کی خام خیالی اور آرزوئیں انسان کو کتاب، الفرقان سے دور لے جاتی ہیں اور یہ نفسیاتی دھوکہ صرف اہل کتاب سے مخصوص نہیں، اہل ایمان بھی اس کی لپیٹ میں ہیں جس کا اظہار اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے سے ہوتا ہے:

لَّيۡسَ بِأَمَانِيِّكُمۡ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهۡلِ ٱلۡكِتَٰبِ

جنت میں داخل ہونے کا دار و مدار نہ تو تم لوگوں (مدعیان ایمان) کی آرزؤں، تمناؤں اور تخیلاتی باتوں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزؤں، تمناؤں اور اختراع کردہ کثرت سے پھیلائی باتوں پر منحصر ہے۔

مَن يَعۡمَلۡ سُوٓءٗا يُجۡزَ بِهِۦ

جو جوئی قابل تعزیر برائی کا ارتکاب کرے گا تو اس کو اس کے موافق سزا دی جائے گی (اگر توبہ اور اصلاح نہیں کی)۔

وَلَا يَجِدۡ لَهُۥ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَلِيّٗا وَلَا نَصِيرٗا ١٢٣

اور اللہ تعالیٰ کے سوائے وہ کوئی خیر خواہ سرپرست اور نہ کوئی مددگار پائے گا جو اسے اس سزا سے نجات دلا سکے۔ (النساء۔ ۱۲۳)

صراط مستقیم کر گامزن رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم مغضوب قوم کے اختراع کئے ہوئے تصورات، طرز فکر اور طرز عمل سے گریز کریں۔

## ٱلضَّآلِّينَ۔ اس کے معنی اور مفہوم

صدق قلب سے ایمان لانے والے ذیلی جملے میں صراط مستقیم کے متعلق اعتماد سے مزید گوش گزار کرتے ہیں:

وَلَا ٱلضَّآلِّينَ ٧

اور اُن سے بھی مختلف جو منحرف، کج رو، دانستہ غافل، اپنے آپ میں مگن ہیں۔ (۷)

ٱلضَّآلِّينَ۔ یہ اسم فاعل، معرفہ باللام، مذکر، جمع سالم، مجرور، ہے۔ تنہا صرف یہاں استعمال ہوا ہے۔ دوسرے پانچ مقامات پر یہ مرکب کا جزو ہے جن میں سے ایک بار موسیٰ علیہ السلام کے قول میں ہے۔

اس جمع اسم فاعل کا واحد۔ ضَآلًّا۔ آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کے لئے سورۃ الضّحیٰ کی آیت مبارکہ ۔۷ میں استعمال ہوا ہے،

اور اس کا مصدر۔ ''ٱلضَّلَلُ''۔ ہے اور یہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے حوالے سے بھی استعمال ہوا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اہم الفاظ میں سے ہے کیونکہ یہ انسانی رویئے (attitude) اور طرز عمل (behaviour) سے متعلق ہے اور رویئے اور طرز عمل کے قابل درگزر یا قابل مؤاخذہ، قابل تعذیر، قابل الزام اور قابل گرفت ہونے کے عوامل الگ ہیں، اس لئے اس کا تفصیلی مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ یہ مطالعہ اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس لفظ کے حوالے سے بعض، بالخصوص انگلش زبان کے مترجمین نے انتہائی غیر ذمہ دارانہ طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے، اور ایسا انہوں نے ترجمہ کرنے کے تمام اکیڈیمک اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر کیا تھا۔

اس کے مادہ ''ض ل ل'' سے بننے والے الفاظ ایک سو اکیانوے (۱۹۱) مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ مصدر، اسم فاعل اور اسم تفضیل چوہتر۔ ۷۴ بار اور فعل ایک سو سترہ۔ ۱۱۷ مرتبہ، اور افعال باب اول ''فَعَلَ'' اور باب چہارم ''افعال'' سے ہیں۔

جناب ابن فارس کے مطابق اس میں سمو یا بنیادی تصور ''ضَياع الشيء'' کا ہے یعنی کسی شئے کا گم ہو جانا، کھو جانا، معدوم ہو جانا، غائب، اوجھل یا الگ ہو جانا؛ اور بنیادی تصور کی مناسبت سے دوسرے سیاق و سباق میں اس کے معنی ''ذهابُهُ في غيرِ حَقِّه'' ہیں یعنی کسی کا اپنی مرضی اور صوابدید سے ایسے راستے پر چل پڑنا جو روشن نہیں، سچائی، انصاف پر مبنی نہیں۔ **ایسے راستے پر جانے کا انجام اندھیروں میں گم ہو جانے پر منتج ہوتا ہے جو اس مادے کا بنیادی تصور ہے۔**

انسان اور جانور کے حوالے سے جب ''ضَياع الشيء'' کے معنی میں استعمال ہو گا تو اس کے معنی اپنے خیالوں میں کھو جانا یا گم ہو جانا، اپنے آپ میں اتنا مگن ہو جانا جیسے ماحول کے لئے وہ کہیں کھو گیا ہو۔ اور اس کا خود ماحول سے اتنا غافل ہو جانا جیسے ماحول اس کے لئے معدوم ہو۔ **تفکر کرتے ہوئے، حقیقت شئے کو جاننے کے لئے انتہائی غور و فکر کی حالت میں اپنے ارد گرد کے ماحول اور یہاں تک کہ وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہ رہے۔**

قرءانِ مجید اپنے الفاظ اور اصطلاحات کے معنی اور مفہوم، حدود، گہرائی اور وسعت کا تعین بھی خود کرتا ہے۔ قرءانِ مجید اس حوالے سے بھی منفرد کتاب ہے کہ یہ اپنے الفاظ اور تصورات (concepts/semantic frames) کیلئے بہترین لغت ہے۔ قرءانِ مجید میں جس انداز میں اس مادہ سے بننے والے الفاظ کو دوسرے الفاظ (collocates) کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے، وہ اس کے معنی اور مفہوم کو نکھار کر عیاں کر دیتا ہے۔

اسم فاعل. ٱلضَّآلِّينَ۔ واحد ضَآلًّا۔ اور مصدر "ٱلضَّلَلُ" کا بنیادی باب اول میں فعل واحد مذکر غائب۔ ضَلَّ۔ ہے۔ یہ چھبیس بار استعمال ہوا ہے اور تین مرتبہ متصل ضمیر فاعل کے ساتھ. ضَلَلْتُ، دو مرتبہ اور۔ ضَلَلْنَا۔ ایک بار۔

لغت کے مطابق اس کے بنیادی معنی "ضَيَاع الشي" ہیں۔ قرءانِ مجید سے بھی یہی معنی واضح ہیں:

ٱنظُرْ كَيْفَ كَذَبُواْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ ۚ

آپ دیکھیں کیسے انہوں نے اپنے متعلق جھوٹ بولا ہے۔

وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُواْ يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

اور ان کے دل و دماغ سے وہ غائب ہو گیا جو زیر مقصد کانٹ چھانٹ کر وہ اختراع کرتے رہتے تھے۔ (الانعام۔ ۲۴)

اس آیت مبارکہ کا دوسرا جملہ بھی چھ بار ہے (الاعراف۔ ۵۳؛ یونس۔ ۳۰؛ ھود۔ ۲۱؛ النحل۔ ۸۷؛ القصص۔ ۷۵)۔ اور مشرکین کے من گھڑت معبودوں کے متعلق ہے۔ فعل ماضی واحد مذکر غائب کا فاعل اسم موصول ہے اور اس کے صلۃ الموصول نے وضاحت کر دی کہ یہ وہ شئے/تصور ہے جو وہ لوگ دنیاوی زندگی میں افترا کیا کرتے تھے، پتھروں کو تراش کر بت بناتے اور انہیں تخیلاتی نام دے کر متعدد خداؤں کا تصور اختراع کرتے تھے۔

وَإِذَا مَسَّكُمُ ٱلضُّرُّ فِى ٱلْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلَّآ إِيَّاهُ ۖ

اور جب سمندر میں سفر کے دوران تم لوگوں کو تکلیف دہ صورتحال کا سامنا ہو جاتا ہے تو سوائے ان (اللہ تعالیٰ) کے وہ سب منظر/تصور سے غائب ہو جاتے ہیں جنہیں تم (پر سکون حالات) میں پکارتے رہتے ہو۔

فَلَمَّا نَجَّىٰكُمْ إِلَى ٱلْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ

تمہاری مدد کی درخواست کو قبول کر کے جب وہ جناب تمہیں خشکی کی جانب بحافظت پہنچا دیتے ہیں، تو پھر اعراض کی روش اختیار کر لیتے ہو۔

وَكَانَ ٱلْإِنسَٰنُ كَفُورًا ﴿٦٧﴾

اور تاریخی حقیقت ہے کہ انسان عمومی طور پر ناشکرا/احسان فراموش ہے۔ (الاسراء۔ ۶۷)

---

وَقَالُوٓاْ أَءِذَا ضَلَلْنَا فِى ٱلْأَرْضِ أَءِنَّا لَفِى خَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ

اور انہوں (عمائدین) نے لوگوں سے استفسار کرتے ہوئے کہا "کیا اس وقت جب ہم زمین میں ملیامیٹ/غائب/تلف ہو چکے ہوں گے تو کیا واقعی ہمیں از سر نو/جدید تخلیق کر کے نکال لیا جائے گا؟"

بَلْ هُم بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ كَٰفِرُونَ ﴿١٠﴾

ان کا یہ سوال کرنا محض لوگوں کو ملتبس کرنا ہے۔ درحقیقت اپنے رب کے حضور احتساب کے لئے پیش کئے جانے کا وہ انکار کرنے والے ہیں۔ (السجدہ۔ ۱۰)

---

وَضَلَّ عَنۡهُم مَّا كَانُواْ يَدۡعُونَ مِن قَبۡلُۖ

اوران کے تصور سے وہ معدوم ہو گیا جسے زمانہ قبل میں وہ پکارتے رہتے تھے۔

وَظَنُّواْ مَا لَهُم مِّن مَّحِيصٍ ٤٨

اورانہوں نے اندازہ کرلیا کہ اب ان کے لئے بچت اور فرار کی کوئی سبیل نہیں۔(فصلت۔۴۸)

ان آیات مبارکہ میں ہم نے دیکھا کہ فعل۔ضَلَّ۔اپنے مادہ کے بنیادی معنی یعنی ''ضَياع الشي'' کے لئے استعمال ہوا ہے۔

ٱلَّذِينَ ضَلَّ سَعۡيُهُمۡ فِي ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا

(خسارا کرنے والے)وہ لوگ ہیں جن کی تگ ودو/جدوجہد دنیا کی زندگی میں تلف و برباد/رائیگاں ہو گئی۔

وَهُمۡ يَحۡسَبُونَ أَنَّهُمۡ يُحۡسِنُونَ صُنۡعًا ١٠٤

جس کے متعلق گمان کرتے تھے کہ وہ اعلیٰ پائے کی کارکردگی کر رہے ہیں۔(الکہف۔۱۰۴)

اردو اور انگلش میں ترجمہ کرنے کے لئے جملے میں بیان کردہ ماحول اور اس کی معیت میں استعمال کردہ الفاظ کی مناسبت سے کرنا چاہئے۔اردو میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں کی سعی/کوشش/جدوجہد کھو گئی یا گم ہو گئی بلکہ مناسب لفظ کسی کی کوشش کا رائیگاں جانا ہے مگر مفہوم وہی ہے جو''ضَياع الشي''کا ہے۔

فعل۔ضَلَّ۔کا جمع کا صیغہ فعل ماضی جمع مذکر غائب۔ضَلُّواْ۔ہے۔

فَمَنۡ أَظۡلَمُ مِمَّنِ ٱفۡتَرَىٰ عَلَى ٱللَّهِ كَذِبًا أَوۡ كَذَّبَ بِـَٔايَـٰتِهِۦٓۚ

ان حقائق کے پیش نظر غور کرو کہ اس شخص سے بڑھ کر کون تخریب اور بگاڑ کرتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے متعلق دانستہ زیر مقصد جھوٹ پر مبنی تصور تخلیق کیا یا جس نے ان کے کلام پر مبنی آیات کو برملا جھٹلایا۔

أُوْلَـٰٓئِكَ يَنَالُهُمۡ نَصِيبُهُم مِّنَ ٱلۡكِتَٰبِۖ

یہ ہیں وہ لوگ جن کو ان کا حصہ (جرم کی ابتدا اور رواج دینے کا)ان کے کھاتے میں پہنچتا رہے گا،اس کتاب میں سے جس میں ہر بات درج ہے۔(سورۃ یٰسین کی آیت۔۱۲ دیکھیں)

حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوۡنَهُمۡ

ایسا اس وقت تک ہوتا رہے گا جب ہمارے رسول(ملائکہ)ان کے پاس پہنچ کر انہیں مجمع میں سے الگ کر رہے ہوں گے۔

قَالُوٓاْ أَيۡنَ مَا كُنتُمۡ تَدۡعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِۖ

انہوں(ملائکہ)نے ان سے پوچھا''وہ کہاں ہیں جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ پکارا کرتے تھے''

قَالُواْ ضَلُّواْ عَنَّا

انہوں(مشرکین)نے جواب دیا''وہ تو ہمارے پاس سے کہیں غائب ہو گئے ہیں''۔

وَشَهِدُواْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمۡ أَنَّهُمۡ كَانُواْ كَٰفِرِينَ ٣٧

اورانہوں نے خود اپنے نفوس کے خلاف گواہی دے دی کہ وہ حیات دنیا میں بشر کو رسول اللہ ماننے سے انکار کرتے رہے تھے۔(الاعراف۔۳۷)

مشرکین نے جزاوسزا کے دن اپنے جن خداؤں کے گم،غائب ہو جانے کا کہاان کے بارے میں خود ہی واضح کر دیا کہ وہ تو پہلے بھی دنیاوی زندگی میں حقیقتاً موجود ہی نہ تھے:

ثُمَّ قِيلَ لَهُمۡ أَيۡنَ مَا كُنتُمۡ تُشۡرِكُونَ ٧٣

بعدازاں ان سے پوچھا گیا"وہ کہاں ہیں جنہیں تم مشترک معبودات کادرجہ دیتے تھے۔

مِن دُونِ ٱللَّهِۖ

اللہ تعالیٰ سے ابتدا کرتے ہوئے ان کے علاوہ"۔

قَالُواْ ضَلُّواْ عَنَّا

انہوں(مشرکین)نے جواب دیا"وہ تو ہمارے پاس سے کہیں غائب ہو گئے ہیں۔

بَل لَّمۡ نَكُنۡ نَّدۡعُواْ مِن قَبۡلُ شَيۡـٔٗاۚ

نہیں،وہ غائب نہیں ہوئے،بلکہ حقیقت یہ ہے کہ زمانہ قبل میں ہم حقیقت میں موجود کسی شئے کو نہیں پکارتے تھے"۔

كَذَٰلِكَ يُضِلُّ ٱللَّهُ ٱلۡكَٰفِرِينَ ٧٤

جان لو؛یہ ہے وہ خود ساختہ کج روی جس میں اللہ تعالیٰ دانستہ انکار کرنے والوں کو حالت انحراف میں گم کردہ راہ رہنے دیتے ہیں۔(غافر۔۷۴)

حیات دنیا میں بیتے زمانے کی قوموں کی ہلاکت کے واقعات بتاتے ہوئے استفسار فرمایااور قاری کو حقیقت بتائی:

فَلَوۡلَا نَصَرَهُمُ ٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُواْ مِن دُونِ ٱللَّهِ قُرۡبَانًا ءَالِهَةَۖ

اگران کا گمان سچائی پر مبنی تھاتو کیوں انہوں(عادعلیہ السلام کی قوم)نے نہیں پکارا جس وقت ان پر آفت آئی تھی اوراس قت کیوں انہوں نے ان کی مدد نہیں کی جنہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ خداؤں کے طور پر دانستہ اختیار کیا تھا،اللہ تعالیٰ کا قرب دلانے والے قرار دے کر۔

بَلۡ ضَلُّواْ عَنۡهُمۡۚ

حقیقت یہ ہے کہ مدد کرنا تو درکنار،وہ ان کے تصور سے کہیں دور غائب ہو گئے۔

وَذَٰلِكَ إِفۡكُهُمۡ وَمَا كَانُواْ يَفۡتَرُونَ ٢٨

اوراے قاری جان لے،یہ ان کا دھوکہ دہی پر مبنی جھوٹ تھا،اور وہ باتیں جو وہ افترا کرتے رہتے تھے۔(الاحقاف۔۲۸)

ان آیات،مبارکہ نے مادہ"ض ل ل"اور فعل۔ضَلَّ۔کے لغت میں بیان کردہ بنیادی معنی"ضَياع الشيء"کی تصدیق کر دی ہے۔اِن معنی میں یہ فعل آقائے نامدار ﷺ کے جسمانی سفر معراج کا احوال بیان کرتے ہوئے استعمال ہوا ہے،یہ بتانے کے لئے کہ بلیک ہول بن چکے ستارے کے جوار سے گزرتے ہوئے وہ اُن پر اثرانداز نہیں ہو سکا تھا؛وگرنہ اپنے جوار میں آنے والی ہر شئے بشمول روشنی کو اپنے اندر جذب کر کے وہ اس کو اوجھل کر دیتا ہے یا اس کی سمت میں خلل پیدا کر دیتا ہے:

وَ ٱلنَّجۡمِ إِذَا هَوَىٰ ١

تمہارے ہمہ تن گوش ہونے کیلئے ہم اُس مخصوص ستارے کی قسم اٹھا کر حقیقت پر مبنی واقعہ بیان کرنے لگے ہیں جو اپنا سب کچھ بکھیر کر خالی دامن ہو چکا تھا۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمۡ

وہ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگوں کے رہنما آقا نہ تو منظر سے غائب ہوئے تھے۔

وَمَا غَوَىٰ ٢

اور نہ وہ راہ سفر سے اِدھر اُدھر ہوئے تھے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلۡهَوَىٰٓ ٣

۔۔مطلع رہو؛ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ(ﷺ)جو واقعہ سفر بیان فرمارہے ہیں(جو انسانی ذہن کے سمجھنے کے لئے پیچیدہ ہے)وہ تخیلاتی خلائی پرواز پر مبنی نہیں ہے۔۔

إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡيٞ يُوحَىٰ ٤

۔۔در حقیقت یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو انہیں بیان کیا جارہا ہے۔۔

---

ٱلضَّآلِّينَ۔ حقیقت سے منحرف گم کردہ راہ لوگ۔

فعل۔ضَلَّ۔اور جمع کے صیغہ۔ضَلُّواْ۔کے ماخذ''ض ل ل''کے بنیادی تصور کی مناسبت سے دوسرے سیاق وسباق میں معنی''ذهابُهُ في غيرِ حَقِّه''ہیں یعنی کسی کا اپنی مرضی اور سوابدید سے ایسے راستے پر چل پڑنا جو روشن نہیں، سچائی، انصاف پر مبنی نہیں۔ایسے راستے پر جانے کا انجام اندھیروں میں گم ہو جانے پر منتج ہوتا ہے، اور گم ہونا اس مادے کا بنیادی تصور ہے۔

أَمۡ تُرِيدُونَ أَن تَسۡـَٔلُواْ رَسُولَكُمۡ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِن قَبۡلُۗ

کیا(اہلِ یہود کی طرح)تم بھی اپنے رسول کریم(ﷺ)سے اِس طرح سوال کرنا چاہتے ہو جیسے زمانہ قبل میں موسیٰ(علیہ السلام)سے کئے گئے تھے؟

وَمَن يَتَبَدَّلِ ٱلۡكُفۡرَ بِٱلۡإِيمَٰنِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ ١٠٨

یاد رکھو جو کوئی ایمان کو بدل کر از خود کفر کرے گا تو وہ معتدل راہ سے یقیناً بھٹک گیا/اس نے معتدل راہ کو کھو دیا۔(البقرۃ۔۱۰۸)۔

---

وَلَقَدۡ أَخَذَ ٱللَّهُ مِيثَٰقَ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ

مبنی بر حقیقت ماضی کی خبر سے مطلع ہو جاؤ؛اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا تھا۔

وَبَعَثۡنَا مِنۡهُمُ ٱثۡنَيۡ عَشَرَ نَقِيبٗاۖ

اور ہم جناب نے ان میں سے بارہ سرکردہ/سربراھان قبیلہ کو بطور ذمہ داران تعمیل قرار دیا۔

وَقَالَ ٱللَّهُ إِنِّي مَعَكُمۡۖ لَئِنۡ أَقَمۡتُمُ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَيۡتُمُ ٱلزَّكَوٰةَ

اور اللہ تعالیٰ نے میثاق کے نکات بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا''یقیناً میں تمام تر مہربانیوں کے لئے تمہارے ساتھ ہوں اگر تم لوگ استقلال واستقامت، منظم طریقے سے

صلوۃ کی ادائیگی کرتے رہو گے اور معاشرے کے نظم و نسق اور معاشی اٹھان کے لئے مالیات دیتے رہو گے۔

وَءَامَنتُم بِرُسُلِى وَعَزَّرْتُمُوهُمْ

اور تم لوگ میرے رسولوں پر ایمان لاتے رہو گے اور ان کا ادب و احترام کرتے ہوئے ساتھ دو گے۔

وَأَقْرَضْتُمُ ٱللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا

اور اگر تم لوگ اللہ تعالی کو قرض دیتے رہے، بہترین قرض جو ان کے بندوں پر خرچ کیا فقط ان کی قدر دانی کے حصول کی خاطر

لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ

تو یقیناً میں تم لوگوں سے سرزد ہوئی کوتاہیوں اور برائیوں کو مستقبل میں تمہارے ریکارڈ سے حذف کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کر دوں گا جن کے پائیں نہریں بہتی ہیں۔

فَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ مِنكُمْ

اس دو طرفہ عہد نامے کے بعد تم میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے گا

فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ ﴿١٢﴾

تو وہ یقیناً استوار راستے کو اپنانے سے منحرف ہو گیا"۔(المائدہ۔۱۲)

فعل۔ضَلَّ۔کا مفعول بہ۔سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ۔ہے۔یہ مرکب اضافی ہے۔مضاف یعنی پہلا اسم مصدر بھی معرفہ ہے بسبب مضاف الیہ معرفہ باللام ہے۔اس کے معنی شئے کا سیدھا ہونا، اور دو کے درمیان توازن ہونا، اور دو چیزوں/باتوں کا ایک جیسا ہونا۔ٱلسَّبِيلِ۔:اس کا مادہ "س ب ل" ہے اور بنیادی تصور کسی شئے کو اوپر سے نیچے گرانا، اور طوالت کا اظہار کرتا ہے۔کسی مقصد تک پہنچنے کا راستہ، طریقہ، طرز عمل۔اس طرح مرکب اضافی کے معنی معتدل، متوازن راہ اور طرز عمل ہے۔

یہ۔سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ۔اللہ تعالی کا مقرر کردہ راستہ/طرز عمل ہے:

ٱدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلْحِكْمَةِ وَٱلْمَوْعِظَةِ ٱلْحَسَنَةِ

آپ(ﷺ)اپنے رب کے راستے کی جانب آنے کی لوگوں کو دعوت دیتے رہیں؛ مخاطب کے بر محل عقل و دانش کو بروئے کار لاتے ہوئے اور انتہائی متوازن نصیحت کرتے ہوئے۔

وَجَٰدِلْهُم بِٱلَّتِى هِىَ أَحْسَنُ

اور آپ(ﷺ)اُن سے اس انداز میں مکالمہ کریں جو موقع محل کے لئے انتہائی مناسب ہے، اثر پذیری کے حوالے سے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِۦ

یقیناً آپ(ﷺ)کے رب ہی ہیں جو ہر اس شخص کو بخوبی جانتے ہیں جو ان کے مقرر کردہ راستے/طرز عمل سے منحرف ہو گیا ہے۔

وَهُوَ أَعْلَمُ بِٱلْمُهْتَدِينَ ﴿١٢٥﴾

اور وہ جناب ان کو بھی بخوبی جانتے ہیں جو خلوص سے راہ ہدایت پر اپنے آپ کو گامزن رکھتے ہیں۔(النحل۔۱۲۵)

---

ذَٰلِكَ مَبۡلَغُهُم مِّنَ ٱلۡعِلۡمِۚ

یہ تصور (حیات دنیا ہی سب کچھ ہے) ان کی پہنچ کی منتہا ہے، حصول علم کے لئے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعۡلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِۦ

یقیناً آپ (ﷺ) کے رب ہی ہیں جو ہر اس کو بخوبی جانتے ہیں جو ان کی راہ سے منحرف ہو گیا ہے۔

وَهُوَ أَعۡلَمُ بِمَنِ ٱهۡتَدَىٰ ٣٠

اور وہ اس شخص کو بھی بخوبی جانتے ہیں جو خلوص سے راہ ہدایت پر گامزن رہتا ہے۔(النجم۔۳۰)

ہدایت کے مقابل بے راہ روی ہے۔اللہ تعالیٰ کے بتائے راستے سے انحراف انسان کو گم کردہ راہ بنا دیتا ہے اور یہ انسان کا سوچا سمجھا فعل ہے:

أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشۡتَرَوُاْ ٱلضَّلَٰلَةَ بِٱلۡهُدَىٰ

یہ متذکرہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے زیر مقصد راہنمائی کے بدلے گمراہی خریدی ہے۔

فَمَا رَبِحَت تِّجَٰرَتُهُمۡ

نتیجے کے طور ان کی اس تجارت (دونوں فریقوں سے مفاد اٹھانے کا خیال اور نظریہ) نے فائدہ نہیں دیا۔

( الٹا اپنے فریق کا اعتماد کھو بیٹھے اور اب انہیں یقین دلانے کے لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اُن کے ساتھ تو ہم مذاق کرتے ہیں )

وَمَا كَانُواْ مُهۡتَدِينَ ١٦

اور وہ اس حالت میں رہے کہ راہ راست کو پانے کے متمنی ہی نہ تھے۔(البقرۃ۔۱۶)

---

أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشۡتَرَوُاْ ٱلضَّلَٰلَةَ بِٱلۡهُدَىٰ

یہ متذکرہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے زیر مقصد راہنمائی کے بدلے گمراہی خریدی ہے۔

وَٱلۡعَذَابَ بِٱلۡمَغۡفِرَةِ

اور اس کاروبار میں عذاب خریدا ہے مغفرت کے عوض۔

فَمَآ أَصۡبَرَهُمۡ عَلَى ٱلنَّارِ ١٧٥

یہ انجام جاننے کے باوجود وہ کیا ہے جس کی وجہ سے انہیں جہنم کی آگ پر بھی تحمل ہے۔(البقرۃ۔۱۷۵)

---

أَلَمۡ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ أُوتُواْ نَصِيبٗا مِّنَ ٱلۡكِتَٰبِ

کیا آپ نے ان لوگوں کے رویئے پر غور کیا ہے جنہیں ام الکتاب میں سے ان کے لئے مخصوص اور متعین کردہ جزو پہنچا دیا گیا تھا۔

يَشۡتَرُونَ ٱلضَّلَٰلَةَ

یہ لوگ (اپنی الگ شناخت کی خواہش میں) دانستہ زیر مقصد ہدایت سے منحرف ہو کر گمراہی کو خریدتے ہیں۔

وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّواْ ٱلسَّبِيلَ ﴿٤٤﴾

اور وہ چاہتے ہیں اور اس تگ ودو میں ہیں کہ تم لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ راستے سے منحرف، کج رو، اپنے آپ میں مگن ہو جاؤ۔ (النساء۔ ۴۴)

بعض طرز عمل ایسے ہیں جنہیں انسان دانستہ اور شدومد سے اختیار کرتا اور اپنائے رکھتا ہے۔ شرک کرنا اور حقیقت کا انکار کرنا گمراہی ہے جس میں انسان اصل راہ سے بھٹک کر بہت دور کھو جاتا ہے:

إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِۦ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَآءُ ۚ

متنبہ رہو؛ یقیناً اللہ تعالیٰ اس حرکت کو قطعاً معاف نہیں فرمائیں گے کہ ان کے ساتھ کوئی (تادم مرگ) کسی کو شریک ٹھہراتا رہے۔ اور وہ جناب حیات دنیا میں اس کے علاوہ کئے گئے (دوزخیوں کے) گناہ معاف فرمائیں گے، جس کسی کے متعلق ایسا چاہیں گے۔

وَمَن يُشْرِكْ بِٱللَّهِ

خبردار رہو، اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک (الٰہ) بنایا

فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾

تو چونکہ ذرے ذرے سے ان کے مطلق ہونے کی حقیقت اظہر من الشمس ہے اس لئے ایسے شخص نے یقیناً حقیقت سے انحراف کیا، اس انداز میں کہ راہ ضلالت میں کہیں دور نکل گیا۔ (النساء۔ ۱۱۶)

---

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ

اے وہ لوگوں جنہوں نے رسول کریم (محمد ﷺ) اور قرءان مجید پر ایمان لانے کا اقرار واعلان کیا ہے توجہ سے سنو!

ءَامِنُواْ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ

اللہ تعالیٰ اور ان کے رسول (کریم محمد ﷺ) پر دل کی شاد سے ایمان لاؤ۔

وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِى نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ

اور اس منفرد کتاب (قرءان مجید) پر جسے ان جناب نے اپنے رسول پر وقفے وقفے سے قسط وار نازل فرمایا ہے۔

وَٱلْكِتَٰبِ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ

اور اس منفرد ایک کتاب پر جسے ان جناب نے زمانہ قبل میں مجتمع انداز میں نازل فرمایا تھا (انجیل)۔

وَمَن يَكْفُرْ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ

متنبہ رہو؛ جو کوئی اللہ تعالیٰ کا انکار کرتا ہے، اور جو کوئی ان کے ملائکہ کا، اور ان کے کلام پر مشتمل نازل کردہ کتابوں کا، اور ان کے رسولوں اور یوم آخر سے انکار کرتا ہے:

فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿١٣٦﴾

تو چونکہ ذرے ذرے سے ان کے مطلق ہونے کی حقیقت اظہر من الشمس ہے اس لئے ایسے شخص نے یقیناً حقیقت سے انحراف کیا، اس انداز میں کہ راہ ضلالت میں کہیں دور نکل گیا۔ (النساء۔ ۱۳۶)

---

إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَصَدُّواْ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ

ان لوگوں کے متعلق حقیقت جان لو جنہوں نے رسول کریم اور قرءان مجید کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور انہوں نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے سے روکا یا منحرف کیا ہے۔

قَدْ ضَلُّواْ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ١٦٧.

یہ لوگ یقیناً حقیقت سے انحراف کر کے گم کردہ راہ ہو گئے، اس انداز میں کہ راہ ضلالت میں کہیں دور نکل گئے ہیں۔(النساء۔١٦٧)

ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا: یہ مرکب توصیفی ہے۔ یہ ماقبل استعمال ہوئے فعل کا مصدر ہے اور اس کا مفعول مطلق ہے۔ مفعول مطلق فعل کو انجام دے جانے کے انداز کو بیان کرنے، یا اس کی شدت کو ظاہر کرنے، یا اس فعل پر زور دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

کیا چوپایوں کو گمراہ تصور کیا جا سکتا ہے؟

رویوں کے حوالے سے ایسے انسانوں کو جو بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، دھیان سے دیکھتے نہیں اور غور سے سنتے نہیں چوپایوں جیسا قرار دیا گیا ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ یہ روش اختیار کرنے والے کہا گیا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ ٱلْجِنِّ وَٱلْإِنسِ

متنبہ رہو؛ یہ حقیقت ہے کہ ہم جناب نے جہنم میں سلگنے کے لئے بکثرت بھوسہ الگ کر دیا ہے یہ درج ذیل "خصوصیات" کے حامل معشر جن وانس سے تعلق رکھنے والے ہیں:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا

قلوب ان کے سینوں میں بھی ان کی نوع کی مانند ان کے استعمال کے لئے موجود ہیں، مگر وہ ان کی مدد سے سمجھتے نہیں۔

وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا

اور آنکھیں بھی ان کی نوع کی مانند ان کے لئے مہیا ہیں مگر ان کو مرکوز کر کے دیکھتے نہیں۔

وَلَهُمْ ءَاذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَآ

اور کان بھی ان کی نوع کی مانند ان کے لئے دستیاب ہیں مگر ان کو سماعت کا آلہ نہیں بناتے۔

أُوْلَٰٓئِكَ كَٱلْأَنْعَٰمِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ

یہ متذکرہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ درحقیقت ان سے بھی زیادہ ماحول سے بے پرواہ ہیں۔

أُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْغَٰفِلُونَ ١٧٩.

۔یہ لوگ ہیں جو حقیقتاً دانستہ غافل ہیں۔(الاعراف۔١٧٩)

لفظ۔أَضَلُّ۔اسم تفضیل ہے دو کے مابین مقابلہ کرنے کے لیے ہوتا ہے۔اس کا مصدر بھی اور مادہ "ض ل ل" ہے۔اس جملے کا ترجمہ کرنے کا یہ رواج ہے:

ڈاکٹر طاہر القادری:''وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے بھی) زیادہ گمراہ،''

جاوید احمد غامدی:''وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔''

گمراہ وہ ہے جو راہ حق سے انحراف کرے۔ گمراہ وہ ہے جو صراط مستقیم کی بجائے دوسری راہوں کو دانستہ اختیار کرے۔ گمراہ وہ ہے جو ہدایت کے منافی، متضاد روش اپنائے۔ کیا آپ چوپایوں کو گمراہ تصور کر سکتے ہیں؟

مروجہ ترجمے ''گمراہ'' کی بجائے۔أَضَلُّ۔کا ترجمہ ''ان سے بھی زیادہ ماحول سے بے پرواہ'' میں نے نہیں کیا۔ یہ ترجمہ قرءانِ مجید نے خود بتایا ہے کہ انہی لوگوں کے متعلق قرار دیا:أُوْلَـٰٓئِكَ هُـمُ ٱلْغَـٰفِلُونَ

أَضَلُّ کی ابتدا غفلت، عدم توجہ ہے۔ چوپائے غافل ہوتے ہیں لیکن درندے ہر پل چوکنا ہوتے ہیں، اس لئے قرءانِ مجید میں انسانوں کی غفلت کے رویئے کو بیان کرنے۔ کیلئے چوپایوں جیسا کہا گیا جانور، درندں جیسا نہیں کہا۔

قرءان مجید میں ٱلدَّوَآبُّ۔یعنی جانوروں کی تقسیم(classification) کرتے ہوئے ''الانعام'' یعنی چارہ کھانے والوں کو دوسروں سے ممیز کیا گیا ہے:

وَمِنَ ٱلنَّاسِ وَٱلدَّوَآبِّ وَٱلْأَنْعَـٰمِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَٰنُهُۥ كَذَٰلِكَ ۗ

اور یہ بھی عام مشاہدہ کی بات ہے کہ ایک علاقے سے تعلق رکھنے والا فرد موجود ہے جو انسانوں میں اور جانوروں میں اور چارہ خور چوپایوں میں منفرد ہے۔ اس ہر ایک کی رنگت دوسروں سے مختلف ہے، اس انتہائی کالے پہاڑ کی مانند۔

إِنَّمَا يَخْشَى ٱللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ ٱلْعُلَمَـٰٓؤُا۟ ۗ

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جاہ وجلال سے ان کے بندوں میں سے صرف وہ مرعوب اور سہمے رہتے ہیں جو معلومات اور علم حاصل کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔

إِنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ ﴿٢٨﴾

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ دائمی، ہر لمحہ، ہر مقام پر مطلق غالب ہیں۔ وہ جناب درگزر اور پردہ پوشی کرنے اور معاف فرمانے والے ہیں۔(فاطر۔۲۸)

جانوروں کی دنیا۔ٱلدَّوَآبِّ۔میں۔ٱلْأَنْعَـٰمِ۔کون ہیں؟ ان کی انفرادیت/فصل کو بیان فرمایا:

إِنَّمَا مَثَلُ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنزَلْنَـٰهُ مِنَ ٱلسَّمَآءِ

اس حقیقت کا ادراک کرو کہ حیات دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے پانی، ہم جناب نے اسے آسمان سے مخصوص مقدار میں برسایا تھا۔

فَٱخْتَلَطَ بِهِۦ نَبَاتُ ٱلْأَرْضِ

چونکہ حالات سازگار ہو گئے تھے اس لئے زمین کی نباتات نے اس کے ساتھ اختلاط کر کے پروان چڑھایا۔

مِمَّا يَأْكُلُ ٱلنَّاسُ وَٱلْأَنْعَـٰمُ

۔۔انسان اور چارہ خور چوپائے ان میں سے اپنے لئے موزوں کو کھاتے ہیں۔۔

حَتَّىٰٓ إِذَآ أَخَذَتِ ٱلْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَٱزَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قَـٰدِرُونَ عَلَيْهَآ

نباتات پھلتی پھولتی رہتی ہیں یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا سنگھار کر لیا اور اپنے آپ کو جاذب نگاہ بنالیا اور اس کے باسیوں نے گمان کر لیا کہ اب وہ اس پر کسی لمحے اختیار رکھنے والے بن جائیں گے۔

أَتَىٰهَآ أَمۡرُنَا لَيۡلًا أَوۡ نَهَارٗا فَجَعَلۡنَٰهَا حَصِيدٗا كَأَن لَّمۡ تَغۡنَ بِٱلۡأَمۡسِۚ

تو ہم جناب کا فرمان رات یا دن کے کسی وقت اس پر پہنچ گیا۔ اس کے نتیجے میں ہم جناب نے اسے کٹا ہوا بھوسا بنا دیا جیسے کہ بیتے کل میں اس (زمین) نے کچھ دیا ہی نہ تھا۔

كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ ٱلۡأٓيَٰتِ لِقَوۡمٖ يَتَفَكَّرُونَ ٢٤

اس طرح کے انداز بیان سے ہم جناب آیات کو جدا جدا موضوعات کے فریم میں تالیف فرماتے ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد ایسے لوگوں کو حقیقت اور مقصد تخلیق کو سمجھنے کے لئے آسان فہم بنانا ہے جو از خود تفکر کرتے ہیں۔ (سورۃ یونسؑ۔ ۲۴)

سورۃ طٰہٰ کی آیت ۵۳ میں بتایا کہ زمین میں مختلف النوع کی نباتات پیدا کی ہیں اور آیت ۵۴ میں فرمایا:

كُلُواْ وَٱرۡعَوۡاْ أَنۡعَٰمَكُمۡۗ

خود کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چارہ کھلاؤ۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَأٓيَٰتٖ لِّأُوْلِي ٱلنُّهَىٰ ٥٤

یقیناً ان عناصر فطرت کے عینی مشاہدہ میں ایسی شہادتیں ہیں جو فلسفہ توحید (معبود مطلق) کی جانب رہنمائی/اشارہ کرنے والی ہیں، خاص کر ان لوگوں کے لئے جو جذبات سے منزہ رہتے ہوئے حقیقت اور مقصدِ شئے کو سمجھنے کی صلاحیت رکھنے والے ہیں۔ (طہٰ۔ ۵۴)

کیا آپ نے اس سوال کا جواب دیا تھا کہ چوپایوں کو گمراہ تصور کر سکتے ہیں؟ ہم مویشیوں کو "گمراہ" تصور نہیں کر سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلِلَّهِ يَسۡجُدُ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلۡأَرۡضِ مِن دَآبَّةٖ

اور یہ جان لو کہ جانوروں میں سے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں حیات ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے۔ (حوالہ النحل۔ ۴۹)

علم اور عقل و فہم کی کسوٹی پر پرکھے بغیر آباؤاجداد کے طور طریقوں، روایتوں اور ڈگر کی تقلید انسان کو راہ راست سے بہت دور لے جا سکتی ہے۔ یہ پرستش ہے۔ یہ عقل و فکر کے ارد گرد بنایا گیا ایسا حصار ہے جو سماعت اور عقل کا باہمی تعلق معطل کر دیتا ہے:

أَمۡ تَحۡسَبُ أَنَّ أَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُونَ أَوۡ يَعۡقِلُونَۚ

کیا آپ (ﷺ) خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر دھیان سے سنتے یا عقل استعمال کرتے ہیں؟

إِنۡ هُمۡ إِلَّا كَٱلۡأَنۡعَٰمِۖ

وہ تو نہیں مگر محض چوپایوں کی مانند۔

بَلۡ هُمۡ أَضَلُّ سَبِيلًا ٤٤

نہیں، بلکہ ان کے متعلق حقیقت کو یوں بیان کرنا بالکل مناسب ہے کہ یہ لوگ زیادہ بے خبر اور لاپرواہ ہیں چوپایوں کی نسبت، راہ پانے کے معاملے میں۔ (الفرقان۔ ۴۴)

اس پر غور کریں کہ ایسے انسانوں کو چوپایوں کی بجائے درندوں کی مانند کیوں نہیں کہا؟اس لئے کہ درندے سماعتوں میں آنے والی ہر نئی آواز پر چوکنا اور خبردار ہو کر اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک اس آواز کی حقیقت کو سمجھ نہ لیں۔

عقل و فکر کے ارد گرد بنائے گئے حصار میں قید اور جکڑے رہنے کی بناء پر سماعتوں سے فیض نہ لینے والوں کی مثال چوپایوں جیسی ہے جو ارد گرد کے ماحول سے غافل بیٹھے جگالی کرتے رہتے ہیں۔یہ نازل کردہ کتاب کی طرف بلائے جانے پر آباؤاجداد کی ڈگر کو جواز بناتے ہیں۔ان کی مثال بتائی:

وَمَثَلُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ

اور ان لوگوں کی مثال جنہوں نے قرءان کو ماننے سے انکار کیا ہے۔

كَمَثَلِ ٱلَّذِى يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ إِلَّا دُعَآءً وَنِدَآءً

اس چرواہے جیسی ہے جو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو ہنکانے پر سماعتوں سے ٹکرانے والی پکار اور اونچی آواز کے سوا کچھ نہیں سنتا۔

صُمُّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ

ایسے لوگ دانستہ بہرے، گونگے، اندھے بنتے ہیں۔

فَهُمۡ لَا يَعۡقِلُونَ ١٧١

لہذا وہ عقل استعمال نہیں کرتے۔(البقرۃ۔۱۷۱)

بات سماعت سے عقل تک نہ پہنچے تو محض اونچی آواز ہے جس میں الفاظ بھی نہ ہوں اور انجام سماعت کے پردے پر ارتعاش کے علاوہ کچھ نہیں۔اس لئے ایسے لوگوں کو چوپایوں کی مانند کہہ کر فرمایا۔بَلۡ هُمۡ أَضَلُّ سَبِيلًا ۔"نہیں، بلکہ ان کے متعلق حقیقت کو یوں بیان کرنا بالکل مناسب ہے کہ یہ لوگ زیادہ بے خبر اور لاپرواہ ہیں چوپایوں کی نسبت، راہ پانے کے معاملے میں۔"(حوالہ الفرقان۔۴۴) کیوں؟ يَنۡعِقُ (مادہ"ن ع ق") نے وجہ بیان کردی ہے۔يَنۡعِقُ۔کے معنی بھیڑ بکریوں کو ھانکنے کے لئے چرواہے کا جھڑکنا اور آوازیں دینا ہیں(تاج، محیط وابن فارس)۔چرواہے کی یہ آواز محض پکار ہوتی ہے جس میں وہ الفاظ استعمال نہیں کرتا۔**لیکن یہ بھیڑ بکریاں چرواہے کی آواز پر نقل و حرکت کرتی ہوئی راستے کو پا ہی لیتی ہیں۔**

چاہے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے اور جانتے ہوں اور نہ راہ راست پر چلتے ہوں، ان کی اندھی تقلید کرنے والوں کی مماثلت ان بھیڑ بکریوں سے کی گئی ہے جو چرواہے کی آواز پر نقل و حرکت کرتی ہیں۔

**مہذب معاشرہ بھی بلا جھجک ایسے شخص کو ضدی اور ہٹ دھرم قرار دیتا ہے جو بلا سوچے سمجھے باپ دادا کی روایات کی تقلید پر بضد اور علم و عقل کی بات پر غور و فکر کیلئے رضامند ہی نہ ہو۔ راست اور کج کا فیصلہ صرف اور صرف کتاب پر موقوف ہے۔** کسی بات اور طریقے کی پیروی کو آباؤاجداد سے منسوب کرنا اس طریقے کے صحیح ہونے کی سند نہیں بن جاتی اور نہ اس روش پر کاربند رہنے کیلئے اسے جواز اور دلیل بنایا جاسکتا ہے۔ **محض قدیم ہونے کی بناء پر کسی بھی بات اور شئے کو تقدیس کی چادر تو نہیں اوڑھائی جاسکتی اور اگر اوڑھا دی جائے تو لوگوں کے عقل و فہم کے گرد یہ ایک حصار بنا دے گی۔**اللہ تعالی کا فرمان ہے:

وَمَا كَانَ لِنَفۡسٍ أَن تُؤۡمِنَ إِلَّا بِإِذۡنِ ٱللَّهِۚ

اس لئے اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ ایمان لانے کا اعلان کرنا بھی کسی شخص کے لئے ممکن نہیں سوائے اس کے کہ اللہ تعالی کا اذن ساتھ ہو(انسان زبان سے بولتا کیسے ہے وہ مطالعہ کریں)۔

وَيَجۡعَلُ ٱلرِّجۡسَ عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يَعۡقِلُونَ ١٠٠

اور وہ جناب ان کے ہٹ دھرم منحرف طرز عمل کو ایسے لوگوں پر چسپاں التباس واضطراب کی آلودگی کا درجہ دے دیتے ہیں جو حقیقت اور باطل کے مابین فرق جانچنے کے لئے عقل استعمال نہیں کرتے۔(سورۃ یونسؑ۔۱۰۰)

اَلرِّجْسَ۔اس کا ماخذ ''ر ج س''اور اس کے بنیادی معنی اختلاط اور التباس ہیں۔گندگی، غلاظت کو بھی رجس اس لئے کہتے ہیں کہ لتھڑا اور چپک جاتی ہے۔ پلیدی، شک، اضطراب، التباس، دل کی تنگی، تعصب، تنگ نگہی، ضد، ہٹ دھرمی، عقل وفکر سے کام نہ لینا۔ایمان لانے میں جو بات رکاوٹ بنتی ہے وہ رجس ہی ہے۔فعل کا دوسرا مفعول محذوف ہے۔

اس مادہ کے استعمال میں ہم نے دیکھا کہ بنیادی معنی سے مماثلت برقرار رہتے ہوئے انسان کے رویئے اور طرز کے لحاظ سے اس کا مطلب کچھ مختلف ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے معنی کو ہم حقیقی زندگی کے واقعات کے حوالے سے (Conotative) تعبیری، تضمینی اور آسان فہم انداز میں مفہوم کہتے ہیں۔سیاق وسباق میں اس مادہ سے بنے الفاظ کے معنی قطعاً واضح ہوتے ہیں۔

کتابوں میں صفات اور افعال کو بیان کرنے والے الفاظ اُس صفت اور فعل کی ابتدا، وسط اور منتہا کے حوالے سے استعمال ہوتے ہیں؛صفت اور فعل کی وسعت اور گہرائی ہوتی ہے اسلئے اس صفت اور فعل کو بیان کرنے والے لفظ کے معنی اور مفہوم وہ صور تحال متعین کرے گی جس میں وہ استعمال کیا گیا ہے وگرنہ اس لفظ کا انتہائی اور متشدد ترجمہ قاری کو کتاب میں بیان کردہ اصل صور تحال کا ادراک نہیں ہونے دے گا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۖ

انہوں (موسیٰ علیہ السلام) نے جواب دیا''ان (پچھلی نسلوں) کے متعلق تمام معلومات/احوال اس کتاب میں مندرج ہیں جو میرے رب کے پاس محفوظ ہے۔

لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى ۝٥٢

میرے رب نہ تو کبھی کسی بھی جانب سے غافل ہوتے ہیں اور نہ کبھی کسی معاملے میں لاپراوہ/لاتعلق ہوتے ہیں۔(طہٰ۔۵۲)

موسیٰ علیہ السلام کے سورۃ طٰہٰ کی آیت مبارکہ ۲۵ میں بیان کئے اس قول کا ترجمہ اور تفسیر کرنے کے عام رواج کی ایک جھلک یہ ہے:

[ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی۔ تفسیر مولانا صلاح الدین یوسف۔قرءانِ کریم شاہ فہد پرنٹنگ کمپلیکس۔سعودی عرب]

''جواب دیا کہ ان کا علم میرے رب کے ہاں کتاب میں موجود ہے، نہ تو میرا رب غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے''

[مولانا احمد رضا خان بریلوی۔کنزالایمان فی ترجمۃ القرءانِ]

''کہا ان کا علم میرے رب کے پاس ایک کتاب میں ہے، میرا رب نہ بہکے نہ بھولے''

[ترجمہ طاہر القادری''(موسیٰ علیہ السلام نے) فرمایا: ان کا علم میرے رب کے پاس کتاب میں (محفوظ) ہے، نہ میرا رب بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے'']

فعل۔ضَلَّ۔کا مضارع کا صیغہ۔یَضِلُّ۔ہے۔اب ہم خود غور کریں کہ اگر موسیٰ علیہ السلام کے نزدیک اس کے وہی معنی ہوتے جو عام طور پر ترجموں میں بیان کیئے گئے ہیں تو کیا ان کے قول میں ان دو باتوں کی ترتیب یوں ہو سکتی تھی کہ ''میرا رب نہ غلطی کرتا/بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے''؟! اگر ان ترجموں میں اختیار کردہ معنی تصور کئے جائیں تو پھر الفاظ کی ترتیب اس کے الٹ ہونا چاہئے کیونکہ ''غلطی''کا نتیجہ ''بھول''نہیں ہوتی بلکہ بھول کے بعد ''غلطی''کا امکان پیدا ہوتا ہے۔

کائنات کا نظام چلانے اور اس کی مسلسل حفاظت کیلئے تمام امور کا پیچھا کرنا پڑتا ہے اور ایسا صرف وہ کر سکتا ہے جو ہر طرح کی کمزوری سے منزہ اور پاک ہو۔فرمایا:

لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ

اونگھ اور نہ ہی نیند کبھی بھی ان پر غالب آسکتی ہے۔(کہ کسی بھی لمحے کائنات اور تم سے غافل ہو)[حوالہ البقرۃ۔۲۵۵]

ہماری اونگھ اور نیند کا نتیجہ دنیا ومافیا سے غافل ہونے کی صورت ہی میں نکلتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے متعلق ''لَّا يَضِلُّ'' کے معنی:

وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُونَ.

اور اللہ تعالیٰ اُس سے کبھی غافل نہیں جو اعمال تم کرتے ہو۔(البقرۃ۔۷۴)

انبیاء علیہم السلام کے حوالے سے۔ ٱلضَّآلِّينَ۔کا استعمال

اللہ تعالیٰ نے آقائے نامدار ﷺ کو قرءانِ مجید میں ایک احسن قصہ بتایا جو یوسف علیہ السلام اور ان کے برادران سے متعلق ہے:

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ أَحۡسَنَ ٱلۡقَصَصِ بِمَآ أَوۡحَيۡنَآ إِلَيۡكَ هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانَ

ہم آپ (ﷺ) کو واقعات میں سے بہترین قصہ من وعن وقوع پذیر ہوئے انداز میں سناتے ہیں جن کے متعلق ہم نے آپ (ﷺ) کو اس قرءانِ مجید میں مطلع فرمایا ہے(کہ جو سوال آئے گا اس کے متعلق ہم قبل ازیں احسن تفسیر منکشف کر چکے ہوں گے۔الفرقان۔۳۳)

وَإِن كُنتَ مِن قَبۡلِهِۦ لَمِنَ ٱلۡغَٰفِلِينَ ٣.

اور اِس (قرءانِ مجید) سے قبل آپ بھی اُن لوگوں میں سے تھے جو اِس قصے کے بارے میں حقائق نہیں جانتے۔

اس قصے میں یوسف علیہ السلام کے ماں سوتیلے بھائیوں کی آپس میں کی گئی گفتگو کے متعلق ان کا یہ قول سورۃ یوسف کی آیت ۸ میں بتایا گیا ہے:

إِذۡ قَالُواْ لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰٓ أَبِينَا مِنَّا وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ

آپ بتائیں ان کی سوانح میں پہلا موڑ اس وقت آیا جب ان کے بھائیوں نے آپس میں کہا'' سچ تو یہ ہے کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے ابا جان کے لئے ہم سے ہٹ کر زیادہ لائق توجہ اور پیار ہیں باوجود اس کے کہ ہم طاقتور جتھا ہیں۔

إِنَّ أَبَانَا لَفِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ٨.

یقیناً ہمارے ابا جان کی ان کی جانب ارتکاز محبت سے ظاہر ہے کہ ہماری جانب سے صریحاً غافل اور عدم توجہ کئے ہوئے ہیں۔

جملے میں حرف مشبہ بالفعل کی خبر محذوف ہے جو قاری کے ادراک کے لئے بعد کے تین الفاظ پر مشتمل دو مرکبات، جار ومجرور اور مرکب توصیفی سے واضح ہیں۔وہ اپنے ابا جان کی کیفیت اور جس حال میں ان کے نکتہ نظر میں مگن ہیں وہ بیان کر رہے ہیں۔جملوں میں محذوف کو نوٹس کرنا اور اس کو قرءان مجید کے متن ہی میں سے متبین کر کے ترجمہ میں شامل کرنا لازم ہے وگرنہ احتمال ہے کہ لاپرواہی سے کیا ترجمہ اصل متن کے تصور اور مفہوم کو بگاڑ دے۔

یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی مکمل بات کو سننے کے بعد میں نے یہ ترجمہ کیا ہے۔جب تک کسی کی بات کو مکمل طور پر نہ سنا جائے بلکہ آدھی بات کو سن کر ہی نتیجہ اخذ کر لیا جائے تو ضروری نہیں کہ ہمارا اخذ کردہ نتیجہ کہنے والے کی بات کے مطابق ہو۔آئیں ان کی بات کو مکمل سنیں:

ٱقۡتُلُواْ يُوسُفَ أَوِ ٱطۡرَحُوهُ أَرۡضً۬ا

تم لوگ یوسف کو قتل کر دو یا اسے کسی دور دراز جگہ پر چھوڑ آؤ۔

يَخۡلُ لَكُمۡ وَجۡهُ أَبِيكُمۡ

ایسا کرنے پر تمہارے اباجان کی تمام تر توجہ و محبت تمہارے لئے ہو جائے گی۔

وَتَكُونُواْ مِنۢ بَعۡدِهِۦ قَوۡمٗا صَٰلِحِينَ ۝٩

اوراس(ناپسندیدہ، گھناؤنے فعل) کے بعد تم لوگ صالح اعمال پر کاربند قوم بن کر رہنا"۔(سورة یوسفؑ۔۹)

یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں کے اپنے والد کے لئے استعمال کئے گئے الفاظ کے اردو اور انگریزی زبان کے بعض مترجمین کے ترجمے سے قاری کے ذہن میں اُن کے متعلق ایک منفی رائے ابھرتی ہے حالانکہ انہوں نے والد کو۔ضَلَـٰلٍ مُّبِينٍ میں سے نکالنے کا طریقہ بیان کرکے اس کے معنی اور مفہوم کو واضح کردیا تھا۔ جس چیز ،والد صاحب کی توجہ اور رغبت، کو پانے کیلئے منصوبہ بندی(حیلہ) کر رہے تھے اس کی متضاد بات کے معنی ہیں کہ "ہماری جانب ان کی توجہ قطعی نہیں، ہم سے قطعی غافل ہیں"۔ معمولی غور سے بھی اگر ہم سوچیں گے تو اس حالت میں مادہ"ض ل ل"کا بنیادی تصور"ضَياع الشي"موجود ہے۔ غافل کے معنی **بے پرواہ، بے فکر، غیر متوجہ، توجہ کا فقدان ہیں۔**

ضَلَـٰلٍ مُّبِينٍ۔اس کے "صریح غلطی، خطا، بہک گئے" مروجہ ترجمے سے قصے کی ابتدا ہی میں قاری کے ذہن میں ان کے متعلق ایک منفی تاثر اور تعصب جگہ بنالیتا ہے۔ان کے متعلق منفی تاثر قائم کرنے سے قبل توجہ اس نکتے پر رہے کہ اُن کی سوچ اپنے دو سوتیلے بھائیوں کے حصے کی وراثت ہتھیانا نہیں بلکہ والد کی توجہ اور محبت پانا تھا۔ **توجہ کی ضد، متضاد عدم توجہ، غفلت ہے۔ توجہ کی ضد گمراہی، صریح غلطی نہیں ہوتی۔** والد کی عدم توجہ اور محبت کا فقدان، یا اولاد کے مابین محبتیں بانٹنے میں دکھائی دے جانے والا وسیع فرق اولاد کی نفسیات میں اس قدر ہیجان برپا کرسکتا ہے کہ اس سے محروم رہنے والی اولاد اُسے پانے کیلئے باپ کی نگاہوں کے محور اپنے بھائی کو مٹانے کے درپے بھی ہوسکتی ہے۔ **انسان میں محبت پانے کی خواہش اس قدر شدید ہے کہ نہ ملنے کی صورت میں بیگانہ اور پاگل ہونے کے علاوہ انسانی سطح سے گری ہوئی باغیانہ روش بھی اختیار کرسکتا ہے۔ برادران یوسف علیہ السلام جذبات سے مغلوب تھے اور سوچ سمجھ کر ایک غلط کام کرنے کا ارادہ اس تطریئے کے ساتھ بنا رہے تھے کہ یہ فعل کرنے کے بعد اپنے والد کی محبت پانے کے بعد صالح بن کر رہیں گے۔**

یوسف علیہ السلام کے بھائی آپس میں کہہ رہے ہیں کہ تعداد میں جمعیت ہم ہیں لیکن ہمارے والد صاحب محبت یوسفؑ اور اس کے بھائی سے کرتے ہیں۔قبائلی معاشروں میں بیٹوں کی تعداد طاقت، معاشی خوشحالی اور عزت کا سبب سمجھے جاتے ہیں اور وہ باپ کے دست و بازو ہوتے ہیں۔ان کے خیال میں عقل و دانائی، معاشرے میں مروجہ انداز اور اصولوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ والد صاحب کی محبتوں کا محور، مرکز وہ ہوتے لیکن ان کی توجہ یوسف علیہ السلام کی طرف ہے جسے وہ اپنی جانب والد صاحب کا عدیم الفرصت ہونا قرار دیتے ہیں۔

بھائی احساس محرومی کا شکار تھے۔وہ والد کی توجہ اور محبت کے طالب تھے۔اس خواہش میں برائی تو کوئی نہ تھی۔ان کا حق بھی تھا۔والد کی محبت پانے کا طریقہ انہیں یہی سوجھا کہ یوسف علیہ السلام کو ان کی نظروں سے دور کردیا جائے۔ مقصود نیک تھا، لیکن طریقہ غلط اختیار کیا جو عرصہ بعد یوسف علیہ السلام کے بقول جذبات سے مغلوب ہونا، نادانی کا مظہر تھا۔نیک مقصد حاصل کرنے کیلئے طریقہ اور راستہ بھی صحیح اور نیک اختیار کرنا چاہئے۔غلط راستوں سے نیک مقصد حاصل کرنے کی خواہش نادانی، جہالت (عربی والا۔جذباتیت) ہے۔والد سے محبت پانے کے جنون میں یہ بھی نہ سوچا کہ جس سے توجہ اور محبت درکار ہے اس کے دل پہ کیا بیتے گی جب یوسف علیہ السلام کو ان کی نظروں سے دور کردیا جائے گا۔وہ یہ **سوچ سکے نہ سمجھ سکے کہ محبت، الفت، توجہ چھینی نہیں جاسکتی۔ محبت پانے کیلئے تو رنگنا پڑتا ہے اپنے آپ کو اس کے رنگ میں جس سے محبت پانے کی خواہش ہے۔**

اس سے قبل کہ کوئی گمان کرے کہ ضَلَـٰلٍ مُّبِينٍ کے معنی اور مفہوم "صریحاً غافل اور عدم توجہ" فلسفیانہ انداز کی بحث کے ذریعے کئے گئے ہیں یہ وضاحت کردینا ضروری ہے کہ کتابوں میں صفات اور افعال کو بیان کرنے والے الفاظ اس صفت اور فعل کی ابتدا، وسط اور منتہا کے حوالے سے استعمال ہوتے ہیں۔صفت اور فعل کی وسعت اور گہرائی ہوتی ہے؛اسلئے اس صفت اور فعل کو بیان کرنے والے لفظ کے معنی اور مفہوم وہ صورتحال متعین کرے گی جس میں وہ استعمال کیا گیا ہے وگرنہ اس لفظ کا انتہائی اور

متشدد ترجمہ قاری کو کتاب میں بیان کردہ اصل صورتحال کا ادراک نہیں ہونے دے گا۔ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ؛ضَلَٰلًا بَعِيدًا؛ضَلَٰلٍ كَبِيرٍ ؛جیسے مرکبات توصیفی سے از خود واضح ہے کہ ''ض ل ل''معمولی، کمتر نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اور بعید اور کبیر بھی؛لیکن اردو زبان کا لفظ''گمراہی، بھٹکا ہوا، گم کردہ راہ''ایک مخصوص تصور (perception)کا حامل ہے جو مختلف صورتوں میں عربی کے لفظ کے تصور کے منافی ہے جس کی وجہ سے کتاب میں بیان کردہ اصل حقیقت کے برعکس خیال قاری کے ذہن میں اجاگر ہوتا ہے۔قرءانِ مجید نے اپنے الفاظ کے معنی کی حدود، ابتدا اور منتہا، وسعت اور گہرائی متعین کی ہوئی ہے اس لئے عجمی زبانوں میں ترجمہ و مفہوم بیان کرتے ہوئے اس نکتے پر توجہ مرکوز رکھنے کی انتہائی اہمیت ہے وگرنہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہوں گے وہ کتاب کی بات نہیں بلکہ ہمارا اپنا خیال ہوگا۔

سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا اپنے والد کی اپنی جانب عدم توجہ اور غفلت کے معنی، زاویہ نگاہ اور مفہوم میں ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ۔استعمال کرنا صحیح بھی تھا کیونکہ بعض مترجمین/مفسرین تو اس کا ترجمہ 'صریح غلطی، خطا کرتے ہیں؟قرءانِ مجید لازوال تفسیر حقیقت اور بیان حقیقت ہے۔واقعات بیان کرتا ہے تو اپنے الفاظ کے معنی اور مفہوم بھی واضح فرماتا ہے۔اس سوال کا جواب قرءانِ مجید، الفرقان ہی سے پوچھتے ہیں۔یہ پہلی مرتبہ سورۃ آلِ عمران کی آیت ۱۶۴ میں آیا ہے۔

لَقَدۡ مَنَّ ٱللَّهُ عَلَى ٱلۡمُؤۡمِنِينَ إِذۡ بَعَثَ فِيهِمۡ رَسُولٗا مِّنۡ أَنفُسِهِمۡ

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت موجود صاحبان ایمان کو احسان کے زیر بار کیا تھا جب انہوں نے ان کے درمیان ایک ایسے شخص کو رسول مبعوث فرمایا جو غیر بنی اسرائیل قوم سے تعلق رکھنے والے مشہور و معروف مومن ہیں۔

يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِهِۦ

وہ انہیں ان جناب کی آیات لفظ بلفظ سناتے ہیں۔

وَيُزَكِّيهِمۡ

اور وہ انہیں سنوارتے/بالیدگی/ارتقاء دیتے رہتے ہیں،(مبنی بر حقیقت معلومات کے ذریعے)

وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ

اور وہ(رسول امین)انہیں ہمارے کلام پر مشتمل کتاب کو پڑھنا لکھنا سکھاتے ہیں اور حکمت، اس میں درج علم کو بروئے کار لانے کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔

وَإِن كَانُواْ مِن قَبۡلُ لَفِي ضَلَٰلٖ مُّبِينٍ ١٦٤

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ قبل ازیں کے زمان میں حکمت و دانائی کو کھوئی ہوئی حالت میں صریح غفلت میں سرگرداں تھے۔(کتاب اللہ ان کی دسترس میں نہ ہونے کے باعث۔حوالہ سورۃ یٰس۔۶)

اسی بات کو سورۃ ٱلۡجُمُعَة کی آیت ۲ میں یوں بتایا ہے:

هُوَ ٱلَّذِي بَعَثَ فِي ٱلۡأُمِّيِّـۧنَ رَسُولٗا مِّنۡهُمۡ

وہ جناب ہیں جنہوں نے غیر بنی اسرائیل قوم، بنی اسماعیل جنہیں پہلے کتاب اللہ نہیں دی گئی تھی، میں ایک ایسے شخص کو رسول مبعوث فرمایا جو ان میں سے تعلق رکھنے والے مشہور و معروف مومن ہیں۔

يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِهِۦ

وہ انہیں ان جناب کی آیات لفظ بلفظ سناتے ہیں۔

وَيُزَكِّيهِمۡ

اور وہ انہیں سنوارتے/بالیدگی/ارتقاء دیتے رہتے ہیں، (مبنی بر حقیقت معلومات کے ذریعے)

وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ

اور وہ (رسول امین) انہیں ہمارے کلام پر مشتمل کتاب کو پڑھنا لکھنا سکھاتے ہیں اور حکمت، اس میں درج علم کو بروئے کار لانے کی تعلیم دیتے رہتے ہیں۔

وَإِن كَانُوا۟ مِن قَبْلُ لَفِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٢﴾

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ قبل ازیں کے زمان میں حکمت و دانائی کو کھوئی ہوئی حالت میں صریح غفلت میں سرگرداں تھے۔ (کتاب اللہ ان کی دسترس میں نہ ہونے کے باعث۔ حوالہ سورۃ یٰس۔٦)

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے متعلق من و عن ایک جیسے الفاظ میں دو بار فرمایا کہ آقائے نامدار ﷺ کے قرءانِ مجید کی آیات سنانے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینے سے قبل ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ۔ میں تھے انہی کے متعلق آقائے نامدار ﷺ سے فرمایا:

تَنزِيلَ ٱلْعَزِيزِ ٱلرَّحِيمِ ﴿٥﴾

قرءان مجید کا بتدریج/سلسلہ وار انداز میں نزول/لوگوں کو پہنچایا جانا ان جناب کا فیصلہ ہے جو دائمی، ہر لمحہ، ہر مقام پر حتماً غالب ہیں۔ وہ منبع رحمت ہیں۔

لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّآ أُنذِرَ ءَابَآؤُهُمْ فَهُمْ غَٰفِلُونَ ﴿٦﴾

اس بتدریج ترسیل کی ایک وجہ یہ ہے کہ آپ (ﷺ) اس قوم کو بطور استحقاق پہلے خبردار کریں جن کے اسلاف کو خبردار نہیں کیا گیا تھا جس کے سبب وہ غفلت میں ہیں۔ [ساتھ مطالعہ کریں؛ الانعام۔٩٢ ؛القصص ۔٤٦ ؛ الشوریٰ۔٧؛اور الجمعہ۔٢]

اللہ رب العزت کی یہ عادت نہیں اور ان کے رحمت کی چھاؤں میں بسائے نظام احتساب و انصاف کا تقاضہ بھی ہے کہ لوگوں کو ان کی غفلت سے بیدار کئے بغیر انصاف کے کھٹن کٹہرے میں کھڑا نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بھیجا تاکہ لوگوں کو اُن کی آیات سنائیں اور انہیں روز قیامت کے متعلق خبردار کریں۔

ذَٰلِكَ أَن لَّمْ يَكُن رَّبُّكَ مُهْلِكَ ٱلْقُرَىٰ بِظُلْمٍ

یہ رسولوں کا بھیجنا اتمام حجت تھا کہ آپ (ﷺ) کے رب کسی لمحے کسی مخصوص بستی کو انساف کے تقاضوں کے برعکس زیادتی سے نیست و نابود کر دیں؛

وَأَهْلُهَا غَٰفِلُونَ ﴿١٣١﴾

اس حال میں کہ اس کے باسی غفلت میں مبتلا تھے۔ (الانعام۔١٣١)

غَٰفِلُونَ: اسم فاعل ہے۔ اس کا مادہ "غ ف ل" ہے۔ اس کے بنیادی معنی ڈھانپ دینا، چھپا دینا، پردہ ڈال دینا، غافل ہونا، غفلت ہیں۔ اس کا مطلب کسی چیز کے متعلق یا کسی کی طرف سے لاپرواہ (Un-mindful) ہو جانا ہے۔ اس لئے اَلْغَفُوْل۔ اُس اونٹنی کو کہتے ہیں کہ جو بچہ چاہے اس کا دودھ پی جائے اور جو آدمی چاہے اس کا دودھ دوہ کر لے جائے اور وہ اس کا کچھ خیال نہ کرے۔ قرءانِ مجید میں یہ لفظ بے خبری اور ناواقفیت کے لئے بھی آیا ہے جس میں مذمت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا (حوالہ سورۃ یوسف۔٣)۔ قرءانِ مجید لازوال تفسیر حقیقت ہے۔ یہ الفاظ اور اصطلاحات کے معنی اور مفہوم کے متعلق اپنے قاری کیلئے کسی قسم کے ابہام اور تشنگی کا امکان نہیں رہنے دیتا۔ قرءانِ مجید سنائے جانے سے قبل جن کی حالت و کیفیت بتائی کہ اس سے قبل ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ۔ یعنی غفلت میں تھے قرءانِ مجید کے نزول کے متعلق بتاتے ہوئے ان ہی لوگوں سے فرمایا:

أَن تَقُولُوٓا۟ إِنَّمَآ أُنزِلَ ٱلْكِتَٰبُ عَلَىٰ طَآئِفَتَيْنِ مِن قَبْلِنَا

اس کے نزول سے تم لوگوں (امیین) کے لئے یہ کہنے کا جواز ختم ہو گیا ہے: "حقیقت تو صرف یہ ہے کہ منفرد کتاب کو ہم سے قبل دو گروہوں (بنی اسرائیل اور نصاریٰ) پر نازل کیا گیا تھا۔

وَإِن كُنَّا عَن دِرَاسَتِهِمْ لَغَٰفِلِينَ ١٥٦

اور ہم یقیناً ان کے درس وتدریس سے بے خبر، غافل تھے"۔ (الانعام۔۱۵۶)

انسان کے پاس کون سی صلاحیت ہے جس کی بناء پر خبر دار، محتاط ہوتا ہے اور اس صلاحیت کے عدم استعمال سے غافل، غیر محتاط، حالتِ غفلت میں ہوتا ہے؟

إِنَّا خَلَقْنَا ٱلْإِنسَٰنَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ

یہ حقیقت ہے کہ ہم جناب نے انسان کو نطفے کے جزوی حصے سے تخلیق کیا ہے۔ اس (نطفے) کی خصوصیت یہ ہے کہ کئی جڑواں جوڑوں کا اجتماع/مخلوط ہے۔

نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَٰهُ سَمِيعًۢا بَصِيرًا ٢

ہم جناب اسے (انسان) آزمانا چاہتے تھے، اس لئے ہم جناب نے اسے سماعت اور بصارت سے بہرہ مند فرمادیا۔ (الانسان۔۲)

إِنَّا هَدَيْنَٰهُ ٱلسَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ٣

یہ حقیقت ہے کہ ہم جناب نے اس کے لئے موضوع راہ کی ہدایت اسے دے دی ہے؛ اب چاہے تو شکر گزار بن کر وہ راہ اختیار کرے اور چاہے تو ہٹ دھرم ناشکرا بنا رہے۔ (الانسان۔۳)

سماعتیں اور بصارتیں علم، معلومات حاصل کرنے اور خبر دار، باخبر ہونے کا ذریعہ ہیں جنہیں دماغ یکجا کر کے علم میں ڈھالتا ہے۔ اور ان معلومات پر عقل و فکر سے انسان نتائج مستنبط کرتا ہے۔

وَٱللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّنۢ بُطُونِ أُمَّهَٰتِكُمْ

اور اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو تمہاری ماؤں کے بطن سے خارج کیا تھا۔

لَا تَعْلَمُونَ شَيْـًٔا

اس حال میں کہ تم لوگ کسی شئے کے متعلق معلومات اور علم نہیں رکھتے تھے۔

وَجَعَلَ لَكُمُ ٱلسَّمْعَ وَٱلْأَبْصَٰرَ وَٱلْأَفْـِٔدَةَ ۙ

اور انہوں نے ایک جزو کو تمہارے لئے سماعت کی لیاقت بنادیا، اور ایک کو بصارتوں کا ذریعہ، اور ایک کو (قلیل تعداد میں) معلومات کو منظم/دم پخت کرنے (علم میں ڈھالنے) والے دماغ۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ٧٨

مقصد یہ تھا کہ علم حاصل ہو جانے پر تم لوگ اظہار تشکر کرو۔ (النحل۔۷۸)

اللہ تعالیٰ نے بعض انسانوں کو حقیقی معنوں میں غافل یعنی راہ ہدایت، صراط مستقیم، ہدایت نامہ قرءان مجید سے منحرفانہ طرز عمل اختیار کر کے گم کردہ راہ بنایا ہے۔

. أُوْلَـٰٓئِكَ هُـمُ ٱلْغَـٰفِلُونَ

یہ لوگ ہیں جو حقیقتاً دانستہ غافل ہیں۔(حوالہ الاعراف۔۱۷۹)

یہ تمام لوگوں کی طرح علم حاصل کرنے کے وسائل کے ساتھ سمجھنے کی صلاحیت سے بھی مزین ہیں مگر دانستہ ان کے استعمال سے گریزاں ہیں،ان کے متعلق بتایا

لَـهُـمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِـهَا

قلوب ان کے سینوں میں بھی ان کی نوع کی مانند ان کے استعمال کے لئے موجود ہیں، مگر وہ ان کی مدد سے سمجھتے نہیں۔

وَلَـهُـمْ أَعْيُـنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِـهَا

اور آنکھیں بھی ان کی نوع کی مانند ان کے لئے مہیا ہیں مگر ان کو مرکوز کرکے دیکھتے نہیں۔

وَلَـهُـمْ ءَاذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِـهَآ ۚ

اور کان بھی ان کی نوع کی مانند ان کے لئے دستیاب ہیں مگر ان کو سماعت کا آلہ نہیں بناتے۔

أُوْلَـٰٓئِكَ كَٱلْأَنْعَـٰمِ بَلْ هُـمْ أَضَلُّ ۚ

یہ متذکرہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ درحقیقت ان سے بھی زیادہ ماحول سے بے پرواہ ہیں۔

---

## موسیٰ علیہ السلام کے قول میں۔ ٱلضَّآلِّيـنَ۔ کے استعمال کے معنی اور مفہوم

موسیٰ علیہ السلام ایک علم والے بندے سے حزطوم میں مجمع البحرین کے مقام پر ملاقات کے بعد جدا ہو کر جس رات شہر میں داخل ہوئے تھے تو آپس میں لڑتے جھگڑتے دو لڑکوں میں سے ایک کے اچانک چیخ کر پکارنے پر انہوں نے دوسرے لڑکے کو مکا مار دیا جس سے وہ اتفاقاً موقعے ہی پر مر گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اگلی صبح مصر سے فرار ہو گئے تھے۔اُس وقت وہ بھرپور جوان اور پورے مرد کی عمر کے تھے۔اور پھر آٹھ دس سال کے عرصے بعد فرائض رسالت تفویض کئے جانے پر اللہ تعالیٰ کے حکم پر فرعون کے پاس آئے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون نے اس اتفاقی حادثہ کا حوالہ دیا تھا اور اس کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا:

قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا

اس (فرعون) نے کہا" کیا ہم نے تجھے بچپن سے اپنے درمیان رکھ کر پرورش اور پروان نہیں چڑھایا۔

وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ﴿١٨﴾

اور تو اپنی عمر کے کئی سال ہمارے درمیان آباد رہا۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ ٱلَّتِى فَعَلْتَ

اور تم نے پہلی مرتبہ اپنی وہ حرکت کی۔یاد کرو وہ پہلی مرتبہ کی ہوئی حرکت جو تو نے کی تھی۔(زیر لب اس اتفاقی قتل کیس کو کھولنے کی دھمکی)

وَأَنتَ مِنَ ٱلْكَـٰفِرِينَ ﴿١٩﴾

اور تو اس وقت جو کر رہا ہے وہ تجھے ان میں شامل کر رہا ہے جو شکر گزار نہیں ہوتے"۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ إِذًا وَأَنَا۠ مِنَ ٱلضَّآلِّيـنَ ﴿٢٠﴾

انہوں (موسیٰ علیہ السلام) نے کہا" میں نے وہ حرکت اس وقت کی تھی جب اچانک مجھے زور سے پکارا گیا تھا جبکہ میں اس لمحے گہرے تفکر میں کھویا ہوا تھا ۔ (القصص۔۱۵ پڑھیں)

## فَفَرَرْتُ مِنكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ

چونکہ مجھے علم ہو گیا تھا کہ آپ لوگ اس حادثے کو جواز بنا کر مجھے پھانسی دینے کا منصوبہ بنا رہے ہو اس لئے میں آپ سے فرار ہو گیا جوں ہی مجھے آپ لوگوں سے خوف محسوس ہوا۔(القصص۔۲۰ پڑھیں)

## فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا

میرا یہ فیصلہ اس صلاحیت کا استعمال تھا جو میرے رب نے جوانی ہی میں مجھے حکمت و دانائی سے نوازا تھا۔(حوالہ القصص۔۱۴)

## وَجَعَلَنِي مِنَ ٱلْمُرْسَلِينَ ٢١

اور ان جناب نے مجھے مختلف اقوام کی جانب بھیجے گئے میں شامل کر کے آپ لوگوں کی جانب بحثیت رسول پیغام دینے کے لئے مقرر فرمایا ہے۔

## وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدتَّ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٢٢

اور جہاں تک اس بھلائی کا تعلق ہے جس کا آپ مجھ پر احسان جتلا رہے ہیں اس حوالے سے کہ آپ نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر رکھا ہوا تھا"۔

موسیٰ علیہ السلام نے مرنے والے شخص کو کسی ہتھیار، ڈنڈے وغیرہ کی ضرب سے نہیں مارا تھا۔ بلکہ گھونسہ مارا تھا لیکن پھر بھی وہ مر گیا۔ تھپڑوں اور گھونسوں سے لوگ مرا نہیں کرتے اور نہ ہی اس انداز سے مارنے والوں پر کبھی ارادہ قتل کا الزام لگایا جاتا ہے۔ فرعون نے بھی ان پر کھلے بندوں قتل کا الزام نہیں لگایا بلکہ ان کے فعل کا حوالہ دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کہہ رہا ہے کہ چاہے اتفاق ہی تھا لیکن مرا تو تمہارے گھونسے ہی سے تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس فعل کو تسلیم کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں۔ مِنَ ٱلضَّآلِّينَ۔ تھا۔ وقوعہ کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس لفظ کے بیان کردہ عمومی معنی گمراہ ہونا، بہکا بھٹکا، راہ سے دور جا پڑا، ضائع ہو گیا، گم ہونا ایک ایسے انسان پر منطبق ہوتے دکھائی نہیں دیتے جس کے مکہ مارنے یا دھکہ دینے سے کوئی شخص مر جائے۔

موسیٰ علیہ السلام نے اس خاص لمحے کے حوالے سے اپنی کیفیت بیان فرمائی تھی اور وقوعہ کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس لفظ کے بیان کردہ معنی "میں راہ بھولے لوگوں میں سے تھا"، "مجھے راہ کی خبر نہ تھی" "میں ناواقفوں میں تھا" کیا ایک ایسے انسان پر منطبق ہوتے ہیں جس کے مکہ مارنے یا دھکا دینے سے کوئی شخص اتفاقی طور پر مر جائے؟ آپ بتائیں کہ مکا مارنے سے کسی شخص کے اتفاقی طور پر مرنے کے حادثہ کا کسی بھی منطق سے علمیت، ہدایت یا گمراہی، راہ بھولنے، ناواقفیت سے کوئی تعلق ملتا ہے؟

موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا مروجہ ترجمہ ماضی کی تقلید ہے کیونکہ بعض قدیم تفسیروں (حوالہ تفسیر ابن کثیر، تفسیر القرطبیؒ) میں مِنَ ٱلضَّآلِّينَ۔ کا ترجمہ اور تفسیر "من الجاهلين" بتایا گیا تھا اور اس 'الجاھلین' کے فارسی/اردو/انگریزی میں مروجہ معنی "جہالت، لاعلمی، کم علمی" ہیں۔ کیا موسیٰ علیہ السلام کے ان الفاظ کے معنی "من الجاهلين" گمان کئے جا سکتے ہیں؟ کیا ہمیں یاد نہیں کہ مکا مارنے سے ایک لڑکے کے مرنے والا واقعہ کب پیش آیا تھا؟ یہ اس کے بعد پیش آیا تھا جب اللہ تعالیٰ انہیں بھرپور جوان ہونے پر حکمت و دانائی سے قوت فیصلہ اور علم عنایت فرما چکے تھے (حوالہ القصص۔۱۴)۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جس بندے کو قوت فیصلہ اور علم عطا ہوا ہو اس علم کے بعد بھی کیا اپنے آپ کو وہ "من الجاهلين" کہہ سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب ہمیں دینا چاہئے کیونکہ معلومات حاصل ہونے کے بعد تعقل کی ابتدا ہوتی ہے۔

مِنَ ٱلضَّآلِّينَ: یہ جار و مجرور محذوف خبر کے متعلق ہے۔ حرف جر. مِنَ. تبین کرنے کے لئے ہے۔ اس فعل کے سرزد ہونے کی وجہ اور اس وقت وہ جس ذہنی استغراق اور اپنے ادھر ادھر کے ماحول سے غفلت کی کیفیت میں تھے وہ بتایا۔ انسان جب کسی نکتے کی گتھیاں سلجھانے میں مستغرق ہوتا ہے تو ماحول سے منقطع، بے خبر ہوتا ہے:

وَدَخَلَ ٱلۡمَدِينَةَ عَلَىٰ حِينِ غَفۡلَةٖ مِّنۡ أَهۡلِهَا

اور وہ (موسیٰ علیہ السلام علم والے بندے سے جدا ہو کر۔الکہف۔۱۸) رات کے وقت شہر میں اس وقت داخل ہوئے جب حالت استغراق میں غافل تھے۔ایسے غافل کے اس میں رہنے والوں میں سے بعض کی اپنے آس پاس موجودگی کو بھی محسوس نہیں کیا۔(حوالہ الشعراء۔۱۵)

موسیٰ علیہ السلام کو اس علم والے بندے نے ایک لڑکے کو قتل کرنے کا سبب بتاتے ہوئے اس فعل کی وجوہات اور مقصد بتایا تھا اور انہیں اللہ کے ارادے کا نتیجہ کہا تھا۔اور واپس مصر میں داخل ہوتے ہی موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں بھی ایک شخص قتل ہو گیا تھا۔موسیٰ علیہ السلام کو پلک جھپکنے میں واضح ہو گیا تھا وہ فرق جو مطلق ہستی اللہ رب العزت اور انسان کی ہستی کا ہے۔مطلق ہستی کا ہر فعل سوچے سمجھے ارادے کا نتیجہ ہوتا ہے اور مقصد کے تابع ہوتا ہے، لیکن انسان سے بلاارادہ و مقصد افعال کے سرزد ہونے کا امکان ہے۔اور اس کے بالمقابل شیطان کا ہر عمل عقل و شعور کے تقاضوں کے منافی ہوتا ہے۔اسی لے جو وقوعہ پیش آچکا تھا اور اس کے پیش آنے کی وجہ اور انداز کے متعلق موسیٰ علیہ السلام نے فوراً فرمایا تھا کہ ''یہ شیطان کے عمل میں سے ہے''۔جبر و قدر کے لغو فلسفہ کی نفی کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا ''میرے رب! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، مجھے بخش دے''۔موسیٰ علیہ السلام کسی نکتے پر سوچ بچار میں محو ہونے کے بناء پر شہر میں اس کیفیت میں داخل ہوئے تھے کہ وہاں کے لوگوں سے حالت غفلت میں تھے۔اس حالت غفلت میں کئے گئے اپنے نادانستہ، بلاارادہ فعل کی بھی ذمہ داری قبول کی اور اللہ رب العزت سے معافی کے طلبگار ہوئے۔اور اہل ثروت کے مفکرین اپنے دانستہ، سوچے سمجھے ارادہ اور مفاد کے تحت کئے ہوئے اعمال کو جبر و قدر کے اختراع کئے فلسفہ کی نذر کر دیتے ہیں۔

ٱلضَّآلِّينَ: کے معنی کی ابتدا انسان سے اُس حالت میں بلاارادہ کوئی غیر مناسب فعل سرزد ہو جانا ہے جب کسی دوسرے خیال میں محو، مگن، ڈوبا ہوا ہو اور کوئی شخص اچانک اسے متوجہ کر لے۔آقائے نامدار رسولِ کریم ﷺ کے فرمان کو یاد کریں۔

قُلۡ إِنَّمَآ أَعِظُكُم بِوَٰحِدَةٍۖ

آپ (ﷺ) تمام لوگوں کو بتائیں ''میں تم لوگوں کو فقط ایک نصیحت کرتا ہوں کہ اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

أَن تَقُومُواْ لِلَّهِ مَثۡنَىٰ وَفُرَٰدَىٰ

وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے تم لوگ خصوصی طور پر قیام کرو، وقت نکالو؛ اس حال میں کہ دو موجود ہوں اور اکیلے تنہا ہو۔

ثُمَّ تَتَفَكَّرُواْۚ

بعض ازاں ایک مقام پر متمکن ہو جانے پر از خود جذبات اور تعصب سے بالاتر ہو کر مقصدیت کے پہلو سے باتوں پر غور و فکر کرو''۔

اللہ تعالیٰ اور قرءانِ مجید میں رسولوں کے فرمودات پر جب بھی دھیان سے توجہ کریں گے تو ایک نیا موتی ملے گا۔آقائے نامدار ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ راہ چلتے تفکر کرو۔ **تفکر انسان کو ارد گرد سے منقطع کر دیتا ہے اور کوئی ایسی صورتحال پیش آسکتی ہے جیسی موسیٰ علیہ السلام کو پیش آگئی تھی۔یہ نکتہ سورۃ المزمل میں بھی واضح کیا ہے کہ انتہائی غور و فکر اور انہماک کی حالت میں انسان کے پاس یہ قدرت نہیں ہے کہ اپنے ارد گرد کی بعض دوسری باتوں کا احساس رکھ سکے۔** سورۃ مبارکہ کی پہلی پانچ آیات میں قیام کے دورانیہ کے متعلق حکم دیا تھا کہ آدھی رات یا اس میں سے کچھ کم یا زیادہ کر لیا جائے لیکن اسی سورۃ کی آیت۔۲۰ سے واضح ہے کہ آقائے نامدار ﷺ اور ان کے ساتھیوں میں سے قیام کرنے والے گروہ سے وقت کے دورانیہ پر گرفت نہیں ہو سکی تھی۔انہوں نے کسی رات دو تہائی رات کسی رات آدھی رات کیلئے اور کسی رات ایک تہائی رات قیام کیا۔یوں اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرما دیا کہ حالت قیام میں قرءانِ مجید کی حسن تناسب اور پورے انہماک سے تلاوت کرتے ہوئے وقت کا اندازہ رکھنا بھی انسان کیلئے ایک مشکل کام ہے کہ قیام کے دوران اس بات کا احاطہ نہ کر سکے کہ رات کے کتنے پہر بیت گئے۔**انسان کے ذہن کی اس محدودیت کو واضح فرمایا گیا کہ یہ ایک وقت پر دو مختلف باتوں پر توجہ مرکوز کر کے ان دونوں کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتا۔**آقائے نامدار ﷺ اور ان کے ساتھیوں کی وقت کے اندازے پر گرفت نہ رہنے کا بتا کر اس نکتے کو واضح فرمایا کہ ان کی تمام تر توجہ اور تفکر کا محور قرءانِ مجید کی آیات مبارکہ تھیں جنہیں آقائے نامدار

ﷺ تلاوت فرماتے تھے۔

## آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کے لئے۔ضَلَّ۔اور۔ضَآلًّا۔کے استعمال کا موقعہ محل اور معنی و مفہوم

اللہ تعالیٰ نے معراج کے سفر کے متعلق کسی کو مخاطب کئے بغیر سورۃ الاسراء کی آیت۔ا میں خبر کو بریک کرنے کے انداز کے بعد اس کے احوال متعلق بتایا:

### وَ ٱلنَّجۡمِ إِذَا هَوَىٰ ١

تمہارے ہمہ تن گوش ہونے کیلئے ہم اُس مخصوص ستارے کی قسم اٹھا کر حقیقت پر مبنی واقعہ بیان کرنے لگے ہیں جو اپنا سب کچھ بکھیر کر خالی دامن ہو چکا تھا۔

### مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمۡ

وہ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگوں کے رہنما آقا نہ تو منظر سے غائب ہوئے تھے۔

### وَمَا غَوَىٰ ٢

اور نہ وہ راہ سفر سے اِدھر اُدھر ہوئے تھے۔

### وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلۡهَوَىٰٓ ٣

۔۔مطلع رہو؛ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ(ﷺ) جو واقعہ سفر بیان فرما رہے ہیں (جو انسانی ذہن کے سمجھنے کے لئے پیچیدہ ہے) وہ تخیلاتی خلائی پرواز پر مبنی نہیں ہے۔۔[یہ جملہ معترضہ ہے]

### إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡيٞ يُوحَىٰ ٤

۔۔در حقیقت یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو انہیں بیان کیا جا رہا ہے۔۔

اس آیت مبارکہ کا ترجمہ اور تفسیر کرنے کے عام رواج کی ایک جھلک یہ ہے:

[ترجمہ مولانا محمد جوناگڑھی۔ تفسیر مولانا صلاح الدین یوسف۔قرءانِ کریم شاہ فہد پرنٹنگ کمپلیکس۔سعودی عرب]

"کہ تمہارے ساتھی نے نہ راہ گم کی ہے نہ وہ ٹیڑھی راہ پر ہے" تفسیر: یہ جواب قسم ہے۔صاحبکم (تمہارا ساتھی) کہہ کر نبی ﷺ کی صداقت کو واضح تر کیا ہے کہ نبوت سے پہلے چالیس سال اس نے تمہارے ساتھ اور تمہارے درمیان گزارے ہیں، اس کے شب و روز کے تمام معمولات تمہارے سامنے ہیں، اس کا اخلاق و کردار تمہارا جانا پہچانا ہے، راست بازی اور امانت داری کے سوا تم نے اس کے کردار میں کبھی کچھ اور بھی دیکھا؟ اب چالیس سال کے بعد وہ نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے تو ذرا سوچو، وہ کس طرح جھوٹ ہو سکتا ہے؟ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ گمراہ ہوا ہے نہ بہکا ہے، ضلالت، راہ حق سے وہ انحراف ہے جو جہالت اور لاعلمی سے ہو اور غوایت وہ کجی ہے جو جانتے بوجھتے حق کو چھوڑ کر اختیار کی جائے۔اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کی گمراہیوں سے اپنے پیغمبر کی تنزیہ فرمائی ہے]

[مولانا احمد رضا خان بریلوی۔ کنزالایمان فی ترجمۃ القرءانِ] "تمہارے صاحب نہ بہکے نہ بے راہ چلے"

[مولانا محمد علی۔بیان القرءانِ] "تمہارا ساتھی گمراہ نہیں ہوا اور نہ بہکا ہے"۔

ترجمے سے واضح ہے کہ اس آیت مبارکہ میں بھی ضَلَّ کے معنی "ذهابُهُ في غيرِ حَقِّه" ہی لئے گئے ہیں۔

باقی تراجم بھی یہی کچھ کہتے ہیں۔معذرت اور دکھی دل سے عرض ہے کہ یہ تراجم علمی کاوش کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ محض ان انگریزی تراجم کا اردو ورژن ہے جو اپنے آپ کو عیسائی کہنے والوں نے بہت عرصہ قبل کئے تھے، جو نیچے درج ہیں۔جنہیں انگریزی نہیں آتی وہ اس کو گوگل میں ڈال کر اردو ترجمہ دیکھ لیں۔

George Sale: your companion Mohammed erreth not, nor is he led astray:

JM Rodwell: Your compatriot erreth not, nor is he led astray,

ان مترجمین پر تو مجھے اتنا زیادہ افسوس اور ملال نہیں ہوتا مگر مجھے سمجھ نہیں آتی کہ طبری اور قرطبیؒ جیسے مفسرین کو کیا مسئلہ درپیش تھا کہ سورۃ کے اس فصل/فریم کے مندرجات کو مدنظر رکھے بغیر اور جملوں کی ساخت اور معنوی لحاظ سے قسم کا تعین کئے بغیر یوں خیال آرائی کی ''ما حاد صاحبكم أيها الناس عن الحقّ ''۔ عجیب مخمصہ ہے کہ انہوں نے کیوں مادہ ''ض ل ل'' کو مادہ ''ح ی د'' سے بدل کر مفہوم بیان کیا اور یہ بھی چیک نہیں کیا کہ ''حاد'' سے ملے جلے تصور میں جب قرءان مجید میں استعمال ہوا تو تخصیص سے ضَلَّ کے ساتھ لکھا گیا ''عَن سَبِيلِهِۦ''۔ اس سے قبل بیان کردہ آیات کے مطالعہ میں ہم انتہائی واضح اور سہل انداز میں سمجھنے کے لئے دیکھ چکے ہیں کہ اس مادہ کا استعمال جب ''ذهابُهُ في غيرِ حَقِّه'' کے حوالے سے ہوا تو اس کو مخصوص، متبین کیا گیا ہے۔

قدیم عربی زبان میں "تفسیر" لکھنے والوں نے نہ جانے کیوں اکیڈیمک اصولوں اور اکیڈیمک اخلاقیات سے تجاوز کرتے ہوئے اصل متن میں مصنف کے پسند کردہ لفظ کو عربی زبان کے کسی دوسرے لفظ سے بدل کر اپنی جانب سے تفسیر (اصل میں تشریح) کرنے کو "رواج" دیا۔ قرءانِ مجید کے بیان میں موقع محل کے حوالے سے الفاظ کے چناؤ میں کمال نفاست، انفرادیت اور مناسبت ہے کہ قاری باریکی سے مگر باآسانی اُس تصور کا ادراک کر سکے جسے اُسے پہنچانا مقصود ہے۔ **اِس لئے انتہائی ضروری ہے کہ اِس کے جملوں کا ترجمہ اور مفہوم بیان کرتے کیلئے اُن میں استعمال ہوئے لفظ کی جگہ کسی دوسرے عربی لفظ کو متبادل سمجھ کر نہ کیا جائے کیونکہ عربی زبان کا ہر ایک لفظ ہر دوسرے لفظ سے انفرادیت کا حامل ہے۔ عربی زبان کا ہر ایک لفظ درحقیقت اپنے آپ میں یکتا ہے۔**

آئیں ایک مرتبہ سورۃ النجم کی پہلی اٹھارہ آیات مبارکہ کی اس انداز میں تلاوت کرنے کو کوشش کریں جیسے ہمارے رہبر، ہمارے صاحب کا انداز ہے تاکہ ہماری تمام تر توجہ ان ہی میں رہے اور کتاب اور ہمارے ذہن کے درمیان خارج از کتاب بات حائل نہ ہو۔

وَرَتِّلِ ٱلْقُرْءَانَ تَرْتِيلًا ۝٤

اور آپ (ﷺ) قرءانِ (مجید) کو حسن تناسب، توازن، یکسانیت، انہماک سے پڑھیں، ترتیل: ایک ایک لفظ کی سہولت اور استقامت سے ادائیگی کرنے کے انداز میں۔ (المزمل۔۴)

الحمدللہ۔ ہم نے سنا کہ ان آیات مبارکہ میں تو آقائے نامدار ﷺ کی مبارک نگاہوں اور بصارتوں نے جو دیکھا تھا اس کا ذکر ہے۔ اور آقائے نامدار ﷺ نے جو دیکھا وہ ہماری عقل و فکر اور ادراک سے ماوراء بات ہے۔ آقائے نامدار ﷺ کی مبارک بصارتوں نے جو کچھ دیکھا وہ ان ہی کی بصارتوں کے شایان شان تھا اور انسان کا علم محدود ہے اس لئے ضروری نہیں کہ ان باتوں کا کماحقہ احاطہ کر سکے۔ گفتگو آسمانوں کے ابواب کے اُس پار موجودات میں عظیم الشان آیت/شئے دیکھنے کی ہو رہی ہے اس لئے ہم ذرا سوچیں کہ گمراہی اور ٹیڑھی راہوں کا تذکرہ کہاں سے بیچ میں آسکتا ہے؟ کچھ اندازہ ہے کہ آیات مبارکہ کی باتیں کائنات کے کس مقام کی ہیں؟ بات کی ابتدا اس قسم سے ہے۔ ارشاد فرمایا

وَٱلنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝١

تمہارے ہمہ تن گوش ہونے کیلئے ہم اُس مخصوص ستارے کی قسم اٹھا کر حقیقت پر مبنی واقعہ بیان کرنے لگے ہیں جو اپنا سب کچھ بکھیر کر خالی دامن ہو چکا تھا۔

جملہ حرف قسم سے شروع ہوا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ابتدا میں کچھ محذوف ہے۔ گفتگو کے آغاز میں قسم انسانوں کے طرز کلام میں معروف ہے کہ اس کا مقصد متکلم کا جواب قسم میں بتائی جانے والی بات اور خبر کو بدیہی حقیقت کے طور پیش کرنا ہے۔ اور قسم ہمیشہ باعظمت اور معروف ہستی یا شئے کی ہوتی ہے۔ ٱلنَّجْمِ۔ معرفہ باللام ہے

(الْجِنْسِيَّةُ لبَيَانَ الحَقِيقَةِ)اور ایک منفرد اور مخصوص ستارے کا حوالہ ہے کیونکہ اس کے بعد اس کا حال بیان ہوا ہے: إِذَا هَوَىٰ۔ ظرف زمان اور فعل لازم، ماضی، واحد مذکر غائب پر مشتمل ان دو الفاظ کو ماہرین گرائمر مرکب اضافی کہتے ہیں۔

هَوَىٰ: اس جملہ فعلیہ کا مادہ "ھ و ی" ہے اور معنی اوپر سے نیچے گرنا۔ چیز جو اوپر سے نیچے کی طرف گری۔ ابن فارس نے اس مادہ میں سموئے بنیادی تصور کو یوں بیان کیا "يدلُّ على خُلُوٍّ وسقوط" یعنی کسی شئے کا خالی، کھوکھلا ہو جانا اور نیچے گرنا، حالت سقوط میں ہو جانا ہیں۔ ستارے آسمان دنیا کی شئے نہیں ہیں۔ ستاروں میں دھماکے ہوتے رہتے ہیں اور ان کا مواد فضا میں گرتا اور بکھرتا رہتا ہے۔ یہ ماہرین فلکیات کی دلچسپی کا موضوع ہے۔ ہم نے تو ایک اندازہ لگانا ہے کہ آیات مبارکہ میں گفتگو کن رفعتوں کے مقام کے متعلق ہے۔ ہمارے قریب ترین جو ستارا (Proxima Centauri) ہے وہ زمین سے بیس ٹریلین میل کے فاصلے پر ہے۔ سورج کی روشنی ہم تک آٹھ منٹوں میں پہنچتی ہے لیکن جو ستارے ہم سے زیادہ دور ہیں ان کی روشنی ہم تک پہنچنے میں اربوں سال بیت جاتے ہیں۔

لیکن اکیسوی صدی میں ہمارے لئے تعجب خیز قرءان مجید میں الفاظ کا چناؤ ہے ایسے جیسے ہمارے زمانے کے علم کے تناظر میں خاص ہمارے لئے ہیں۔ مخصوص ستارے کی تصویر کشی کے انداز میں جو کیفیت بیان ہوئی وہ ہمیں آج انسانگلوپیڈیا اور "ناسا" (NASA) والے اس ستارے کا حال بتاتے ہیں جسے هَوَىٰ حالت میں "بلیک ہول" کا نام دیتے ہیں۔ یہ انتہائی گھناٹھوس ہے جس کی کشش ثقل اس قدر زیادہ ہے کہ جو کوئی شئے اس کے قریب ہے حتیٰ کہ روشنی بھی، یہ اسے کھینچ اور جذب کر کے ماحول سے اوجھل کر دیتا ہے۔

NASA Science **Black Holes**

"If the collapsed stellar core is larger than three solar masses, it collapses completely to form a black hole: an infinitely dense object whose gravity is so strong that nothing can escape its immediate proximity, not even light. Since photons are what our instruments are designed to see, black holes can only be detected indirectly. Indirect observations are possible because the gravitational field of a black hole is so powerful that any nearby material - often the outer layers of a companion star - is caught up and dragged in. As matter spirals into a black hole, it forms a disk that is heated to enormous temperatures, emitting copious quantities of X-rays and Gamma-rays that indicate the presence of the underlying hidden companion."

قرءان مجید میں ایک حقیقی مادی واقعہ کے بیان (narrative) کے پیش نظر ستاروں کی دنیا کے ان ماہرین کی معلومات کو حتمی تسلیم کر لینا چاہئے کیونکہ یہ وقوعہ کے بیان میں اس محذوف حصے کی نشاندہی کرتا ہے جو القصص کا لازمی جزو ہے یعنی مسئلہ (complication) کیا در پیش تھا۔ جواب قسم میں بتایا گیا کہ آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کو یہ مسئلہ در پیش نہیں ہوا جس نے ہم سب کو بتا دیا کہ بلیک ہول میں غائب ہونے سے استثناء کی مثال موجود ہے:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ

وہ حقیقت یہ ہے کہ تم لوگوں کے رہنما آقا نہ تو منظر سے غائب ہوئے تھے۔

القصص کے متن کی خاص بات یہ ہے کہ صیغے ماضی ہوتے ہیں۔ یہاں فعل لازم ماضی ضَلَّ کے اِس کے ماخذ کے بنیادی تصور "ضَياع الشيء" کے علاوہ دوسرے معنی نہیں کئے جا سکتے۔ اور اس کے بعد دوسری نفی نے تو گمان کے دروازے بھی بند کر دیئے کہ منظر سے غائب ہونے کے علاوہ اس کے کچھ اور معنی کئے جا سکتے ہیں۔

وَمَا غَوَىٰ ۚ

اور نہ وہ راہ سفر سے اِدھر اُدھر ہوئے تھے۔ (النجم۔ ۲)

اس مخصوص ستارے کی کشش کی وجہ سے ایک اور ممکنہ اثر کے متعلق بھی بتادیا کہ ان ﷺ نے ایسا اثر نہیں لیا تھا۔ فعل ماضی لازم۔غَوَىٰ۔ کا ماخذ "غ و ی" ہے جس میں سمویا بنیادی تصور متعین کردہ راست راہ (رشد) سے ادھر ادھر ہو جانا ہے۔ سفر کا آغاز کرنے سے پہلے گزرگاہ (route) کو متعین کر لیا جاتا ہے۔ رسول کریم ﷺ اس بلیک ہول بنے ستارے کے نواح سے بغیر اپنے متعین راستے (گزرگاہ۔روٹ) سے ادھر ادھر ہوئے منزل کی جانب محو سفر رہے تھے۔

رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں پیش آئے اس واقعہ اور بیان کی نوعیت ایسی ہے کہ عام آدمی تو کیا آج کے آئین سٹائین (Albert Einstein) اور سٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) کے پائے کے سائنسدانوں کے دماغ کو چکرا کر رکھ دے کہ چودہ سو سال قبل کیسے ممکن تھا۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ قرءان مجید میں تو اس سے ہزاروں سال قبل کا واقعہ بھی درج ہے جب چند لوگوں کو ایک بھاری مادی شئے کو ایک ملک کے دار الخلافہ سے دوسرے ملک کے دار الخلافہ کے محل میں پلک کی جنبش کے دورانیے میں منتقل کرنے پر دسترس حاصل تھی۔ اور وہ آج "کو اسم اِینٹیگل مینٹ۔Quantum entanglement" پر کام کر رہے ہیں۔ اور اگر عظیم سائنسدان آئین سٹائین نے قرءان مجید کو پڑھا ہوتا تو نہ وہ کرتا جسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی "بلنڈر۔Cosmological constant" قرار دیا، اور اگر کائنات کو پھیلتی دیکھ لینے کے بعد بھی پڑھ لیا ہوتا (الانعام۔١؛الرعد۔٤١؛الانبیاء۔٤٤۔١٠٤؛الزمر۔٦٧؛فصلت۔٥٣؛اور الذاریات۔٤٧) تو اپنی اس بلنڈر کو بھی ایک منفرد دریافت کے طور زیادہ یقین سے دنیا کو دے جاتے۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کی نفسیات بخوبی جانتے ہیں کہ جو بات ان کے احاطہ ادراک سے باہر ہو اور ان کے پاس معلومات نہ ہوں تو بعض ہرزہ سرائی سے بھی نہیں چوکتے کہ اپنی کم علمی اور محدودیتِ ادراک کو نہیں مانتے۔ اس سے پہلے کہ کوئی ہرزہ سرائی کرے، اللہ تعالیٰ نے جملہ معترضہ کے ذریعے احوال سفر کو جاری رکھنے سے پہلے واضح فرمادیا:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلۡهَوَىٰٓ ٣

۔۔مطلع رہو؛ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ (ﷺ) جو واقعہ سفر بیان فرما رہے ہیں (جو انسانی ذہن کے سمجھنے کے لئے پیچیدہ ہے) وہ تخیلاتی خلائی پرواز پر مبنی نہیں ہے۔۔

إِنۡ هُوَ إِلَّا وَحۡيٌ يُوحَىٰ ٤

۔۔درحقیقت یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو انہیں بیان کیا جارہا ہے۔۔(النجم۔٤)

قرءان مجید کے ترجمہ اور مفہوم کو بیان کرنے کے لئے اور جملوں میں ربط اور غایت کے ادراک کے لئے حروف کے استعمال کی نوعیت کو متبین کرنا لازم ہے۔ حرف عطف "وَ" عربی زبان میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ موقع محل کی مناسبت سے اس کے استعمال کے معنی اور غایت مختلف ہے جس کو متبین کرنا بالکل واضح ہے اگر اُس کے اپنے سے ما قبل لفظ اور بعد والے لفظ کے مابین تعلق یا عدم تعلق کو دیکھ لیا جائے۔ ماقبل لفظ/جملے کا مابعد لفظ سے تعلق نہیں ہے کہ ایک ماضی کا صیغہ ہے اور مابعد جملے میں فعل مضارع مرفوع ہے جس میں مستتر ضمیر اس لمحے لوگوں سے متکلم "صَاحِبُكُمۡ" کو راجع ہے۔ یہاں "وَ" حقیقت اور "صَاحِبُكُمۡ" کے اس لمحے کے حالیہ بیان کو انتہائی تاکیدی، واثق انداز (emphatic) میں واضح کرنا ہے؛ پہلے منفی کرکے اور پھر اس بیان کے منبع کو بتاکر۔ حرف نفی کے بعد منفصل ضمیر "هُوَ" اس القصص کو راجع ہے جو "صَاحِبُكُمۡ" اس لمحے "يَنطِقُ" اپنی زبان اور ہونٹوں سے بول رہے ہیں۔ تمہارے صاحب من وعن انہی الفاظ اور ترتیب میں بول رہے جیسے خود انہیں زبانی سنائے جارہے ہیں۔

الفاظ کے چناؤ اور انداز بیان میں وہ صراحت و بلاغت ہے کہ جنہیں زمان و مکان (Time and space) کے مدغم (warping) ہونے کے متعلق معلومات حاصل ہیں وہ چونک کر سہم جائیں گے۔ دس لفظوں میں بلیک ہول کے نواح میں جہاں زمان و مکان سمٹتے ہیں، رسول کریم ﷺ کا کائنات کے کناروں سے باہر جانے کے سفر میں منفی اثرات کی نفی کے بعد ان ﷺ کے زبان مبارک سے اس قصہ کی روئداد کے بارے دس لفظوں میں جس حقیقت کو بیان فرمایا اس انداز میں بھی زمان و مکان کے سمٹنے کا عنصر موجود ہے۔ "صَاحِبُكُمۡ" کو زبانی سنایا جارہا ہے اور وہ بیک وقت تم لوگوں کو سنا رہے ہیں۔ آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کو عرش معلیٰ دکھانے کے لئے کائنات کی معراج تک کا سفر کرایا گیا جس میں انہوں نے مکان کو زمان میں سمٹتے اور انجماد کا مشاہدہ بھی کیا۔ زمان و مکان کے انجماد کو ہمارے سمجھنے کے لئے جملہ معترضہ میں

یوں ظاہر کیا کہ اللہ تعالیٰ عرش معلیٰ سے تمہارے صاحب سے کلام کر رہے ہیں جس کو بیک وقت اپنی زبان سے وہ تم کو بیان کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ، رسول کریم ﷺ اور تمہارے مابین زمان و مکان حائل نہیں ہو رہا۔ یہ انجمادِ زمان و مکان کو سمجھنے میں معاون ہے۔

ہمیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ۔ ٱلضَّآلِّينَ۔ اور اس کے ماخذ/جذر۔ "ض ل ل" کا مطالعہ کرتے ہوئے اس منزل پر پہنچ جائیں گے۔ یہ حقیقت کی منزل ہے۔ اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟ قرءان مجید آقائے نامدار، رسول کریم ﷺ کی ابتدائے آفرینش، ازل سے ابد تک کی بائیو گرافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدَىٰ ۝٧

اور انہوں نے آپ (ﷺ) کو جستجوئے حقیقت میں استغراق میں پایا۔ چونکہ آپ منتہائے حقیقت کو عین الیقین سے جاننے کے آرزو مند تھے اس لئے ان جناب نے آپ کو حقیقت تک پہنچنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔ (الضحیٰ۔ ۷)

جملہ فعلیہ معطوفہ؛ فعل؛ فاعل مستتر؛ مفعول بہ اول متصل؛ مفعول ثانی۔ حرف عطف۔ فعل ماضٍ مبني على الفتح/الفاعل:ضمير مستتر جوازاً تقديره:هُوَ–واحد مذكر غائب۔ ضمير متصل في محل نصب مفعول به /واحد مذكر حاضر+مفعول ثانی:اسم فاعل: منصوب–واحد مذكر۔ماخذ"ض۔ل۔ل"۔۔فَهَدَىٰ ۔ حرف فَ (الفصيحة)+ فعل ماضٍ مبنى على الفتح المقدر على الألف للتعذر/الفاعل :ضمير مستتر جوازاً تقديره:هُوَ–واحد مذكرغائب ماخذ"ھ۔د۔ی"

اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کرتے ہوئے بھی مترجمین کی اکثریت نے اس اسم فاعل "ضَآلًّا" کو بجائے "ضَياع الشي" کے معنی کے اللہ تعالیٰ کے بیان میں اپنی جانب سے اضافہ کر کے "ذهابُهُ في غيرِ حَقِّه" کے مفہوم میں بدل دیا۔ جناب رضا خان بریلوی نے متن اور سیاق و سباق کا جائزہ لے کر اس کا خوبصورت ترجمہ کیا تھا اگرچہ دوسرے مقامات پر وہی سہو کی جس کے مرتکب دوسرے مترجمین ہوئے۔ ترجمہ: "اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی راہ دی"۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ

اے وہ لوگوں جنہوں نے رسول کریم (محمّد ﷺ) اور قرءان مجید پر ایمان لانے کا اقرار و اعلان کیا ہے توجہ سے سنو!

لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفۡعَلُونَ ۝٢

تم لوگ وہ بات کیوں لوگوں سے کہتے ہو جس پر خود ایک بار بھی عمل پیرا نہیں ہوتے۔

كَبُرَ مَقۡتًا عِندَ ٱللَّهِ أَن تَقُولُواْ مَا لَا تَفۡعَلُونَ ۝٣

اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ انتہائی انداز ہے ناپسندیدگی، بیہودہ پن اور برے چلن کے حوالے سے کہ تم وہ بات کہو جس پر خود ایک بار بھی عمل پیرا نہیں ہوتے۔ (الصف۔ ۳)

آقائے نامدار، نبیّ امیّ کی حیات طیبہ قرءان مجید عنایت کئے جانے اور منصب رسالت پر فائز کئے جانے سے قبل اور بعد میں اوپر بیان کردہ بات سے منزہ ہے۔ آقائے نامدار ﷺ وہ بات نہیں فرماتے جس پر خود کاربند نہ رہے ہوں۔ انہوں نے انسان کو ایک نصیحت فرمائی ہے:

قُلۡ إِنَّمَآ أَعِظُكُم بِوَٰحِدَةٍۖ

آپ (ﷺ) تمام لوگوں کو بتائیں" میں تم لوگوں کو فقط ایک نصیحت کرتا ہوں کہ اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

أَن تَقُومُواْ لِلَّهِ مَثۡنَىٰ وَفُرَٰدَىٰ

وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے تم لوگ خصوصی طور پر قیام کرو، وقت نکالو؛ اس حال میں کہ دو موجود ہوں اور اکیلے تنہا ہو۔

ثُمَّ تَتَفَكَّرُواْ

بعض ازاں ایک مقام پر متمکن ہو جانے پر از خود جذبات اور تعصب سے بالاتر ہو کر مقصدیت کے پہلو سے باتوں پر غور و فکر کرو"۔ (حوالہ سباء۔۴۶)

تفکر جستجو کا نام ہے۔ تفکر حقیقتِ شئے کی جستجو ہے۔ اور تفکر بھی دنیا و مافیا سے اعصابی نقطۂ نظر سے کچھ دیر کیلئے انسان کو بے خبر، غافل کر کے رفعتوں اور حقیقتوں سے باخبر کر دیتا ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلّٗا فَهَدَىٰ ٧

اور انہوں نے آپ (ﷺ) کو جستجوئے حقیقت میں استغراق میں پایا۔ چونکہ آپ منتہائے حقیقت کو عین الیقین سے جاننے کے آرزو مند تھے اس لئے ان جناب نے آپ کو حقیقت تک پہنچنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔ (الضحیٰ۔۷)

ضَآلّٗا۔ اسم فاعل۔ یہ ایک ایسے شخص کو کہتے ہیں جو خود رفتگی، کسی نکتے کو سلجھانے کے لئے استغراق کی حالت میں اپنے آپ کو رکھ رہا ہو۔ ایسا شخص اپنے آپ میں غرق حالت میں دیکھنے والوں کے لئے اپنے ارد گرد کے ماحول سے غافل اور انحراف میں دکھائی دیتا ہے۔ **یہ تنہائی میں تفکر کرنے کی اوج کا انداز ہے۔** اور اس کے بعد حرف "فَ الفصیحة" نے طشت از بام کر دیا کہ جستجوئے حقیقت میں وہ مستغرق تھے تو انہیں حقیقت سے نہ صرف آشنا کر دیا بلکہ ازل سے ابد کی حقیقت کو آسمانوں سے باہر عرش اقتدار تک رسائی دے کر بصارتوں کو دکھا بھی دیا۔ یہ الکوثر ہے، سرچشمہ ہدایت، علم و حقیقت۔ یہ قربت کے تعلق کی منتہا ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اور میرے آقا، آقائے نامدار پر سلام ہے ہر لمحہ صبح و شام۔

میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ مترجمین اور مفسرین کی اکثریت کو کیا کتاب کو پڑھنے اور سمجھنے اور اس کے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کے بنیادی قواعد و ضوابط معلوم نہیں تھے جنہوں نے اس کا ترجمہ کرنے کے لئے "راستے سے بے خبر، ناواقف راہ، بھٹکتا، wandering" جیسے الفاظ منتخب کئے۔

یہ جملہ کس سلسلہ کلام کا ذیل جملہ ہے؟ اس کا:

وَٱلضُّحَىٰ ١

ہم قسم اٹھا کر اعلان کرتے ہیں، قسم ہے روشن اجالے دن کی

وَٱلَّيۡلِ إِذَا سَجَىٰ ٢

اور رات کی جب وہ گہرے سکوت میں ہو جاتی ہے۔

جن اوقات کی قسم اٹھا کر جواب قسم میں ایک بات کو بتایا گیا ہے وہ اوقات ایسے ہیں جن کے متعلق کسی کو کوئی ابہام نہیں ہو سکتا اور ان کی قسم سے تمام زمان پر یہ بات محیط ہو جاتی ہے۔ "رانجھا رانجھا کر دی میں آپے رانجھا ہوئی" شاعر کے تخیل کی پرواز ہے، حقیقت سے اس کا واسطہ نہیں۔ یک جان محسوس کر کے بھی قالب دو ہی رہتے ہیں۔ ادغام ممکن نہیں۔ فلسفہ عشق شاعروں کی تخیلاتی پرواز ہے۔ عشق وہ کیفیت ہے جس میں لین دین کا سوال نہیں ہوتا، لیکن انسان کا شرف یہ ہے کہ لین دین کی زنجیروں سے جکڑا ہے۔ محبت میں لین دین بھی ہے اور تشہیر بھی جائز ہے۔

عشق کا دعویٰ نہیں ہوا کرتا کہ دعویٰ عشق ہی کو مشکوک بنا دے گا۔ خامشی میں پنہاں ہے لطف و لذت عشق۔ عشق کا دعویٰ تو وہ بھی نہیں کرتے جو اپنے آپ کو الصمد کہلوانا

پسند فرماتے ہیں۔ عشق کو بھی طشت از بام کبھی کرتا ہے کوئی!

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ﴿٣﴾

آپ (ﷺ) کے رب نے آپ کو کبھی الوداع نہیں کیا اور نہ کبھی آپ کے رب نے اپنے آپ کو آپ سے جدا کیا۔

وَدَّعَكَ۔ یہ باب تفعیل کا فعل ہے جس کے معنی اس کے مفعول میں وہ حالت اور صفت پیدا کر دینا جو اس کے بنیادی معنی ہیں۔ ماخذ "و۔د۔ع"۔ جناب ابن فارس نے اس کے تصور کو یوں بیان کیا "يدلُّ على التَّرْك والتَّخْلِية" کہ یہ کسی کو ترک کر دینے اور اپنے پاس سے الوداع، رخصت کر دینا ہے۔ اور "قَلَىٰ " کے ماخذ "ق۔ل۔و" کے معنی کسی سے اپنے آپ کو جدا کر لینا، الگ تھلگ کر لینا (alienation, estrangement and turning away from)۔ اس سے بڑھ کر نہ قربت و الفت، چاہت، انس ممکن ہے اور نہ اس سے بہتر انداز میں اس کا اظہار کرنا ممکن۔ یہ محبت کی اوج ہے۔

آپ خود غور کریں کہ کیا ایسی ہستی کے متعلق ان الفاظ کے اطلاق کا گمان بھی جا سکتا جو کئی مترجمین نے استعمال کئے۔

جستجو ایک سوال ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے رسولِ کریم ﷺ کی جستجو کو پورا کر دینے کے صلے میں ان سے اس روش کو اپنانے کا مطالبہ فرمایا:

وَأَمَّا ٱلسَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿١٠﴾

اور جہاں تک جستجوئے علم کے لئے سوال کرنے والے کا تعلق ہے، اس کے سوال کرنے پر اسے مایوس اور سرگرداں نہ رہنے دیں۔ (الضحیٰ۔ ۱۰)

الحمدللہ قرءانِ مجید کی آیات مبارکہ ایک دوسرے کے معنی و مفہوم کو نکھار کر واضح کر دیتی ہیں اور ہمیں اس مطالعہ میں ماخذ/جذر "ض ل ل" کا بنیادی تصور واضح ہو گیا کہ "ضَياع الشيء" کا ہے یعنی کسی شئے کا گم ہو جانا، کھو جانا، معدوم ہو جانا، غائب، اوجھل یا الگ ہو جانا؛ اور بنیادی تصور کی مناسبت سے دوسرے سیاق و سباق میں اس کے معنی "ذهابُهُ في غيرِ حَقِّه" ہیں یعنی کسی کا اپنی مرضی اور صوابدید سے ایسے راستے پر چل پڑنا جو روشن نہیں، سچائی، انصاف پر مبنی نہیں۔ **ایسے راستے پر جاتے کا انجام اندھیروں میں گم ہو جانے پر منتج ہوتا ہے جو اس مادے کا بنیادی تصور ہے۔**

انسان اور جانور کے حوالے سے جب "ضَياع الشيء" کے معنی میں استعمال ہو گا تو اس کے معنی اپنے خیالوں میں کھو جانا یا گم ہو جانا، اپنے آپ میں اتنا مگن ہو جانا جیسے ماحول کے لئے وہ کہیں کھو گیا ہو۔ اور اس کا خود ماحول سے اتنا غافل ہو جانا جیسے ماحول اس کے لئے معدوم ہو۔ **تفکر کرتے ہوئے، حقیقت شئے کو جاننے کے لئے انتہائی غور و فکر کی حالت میں اپنے ارد گرد کے ماحول اور یہاں تک کہ وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہ رہے۔**

اس ابتدائی معنی اور مفہوم "غفلت، غافل" واضح ہوئے ہیں۔ عدم احتیاط غفلت کی ابتدا ہے۔ خبردار کئے جانے پر حالت غفلت ٹوٹ جاتی ہے۔ استغراق، غور و فکر میں محو ذہن (deep thinking) کا اعصابی رابطہ بھی ارد گرد سے منقطع ہو سکتا ہے اور اس دوران ماحول سے غافل، حالت غفلت میں ہو سکتا ہے۔ کسی کی محبت اور جستجو اور ملنے کی خواہش میں مگن شخص کے متعلق بھی دوسروں کو گمان ہو سکتا ہے کہ حالت غفلت میں ہے۔ یعقوب علیہ السلام کی یوسف علیہ السلام کی جدائی کے غم میں حالت کچھ ایسی ہی تھی۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ ٱلْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّى لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ ۖ

اور جوں ہی قافلہ شہر کی فصیل سے باہر پہنچا تھا تو اس وقت ان کے والد نے اپنے پاس موجود لوگوں سے کہا "میں حقیقت میں یوسف کی مہک کو موجود پا رہا ہوں

لَوْلَآ أَن تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾

اگر تم لوگ میری اس بات کو بڑھاپے کا کمزور تخیل نہ سمجھو تو وہ مہک تمہیں بھی محسوس ہو گی"

قَالُواْ تَٱللَّهِ إِنَّكَ لَفِى ضَلَـٰلِكَ ٱلْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾

انہوں نے جواب دیا ''اللہ تعالیٰ کی قسم! سچ یہ ہے کہ حقیقت تسلیم کرنے کی بجائے آپ ابھی تک اپنے قدیم تصور میں کھوئے ہوئے ہیں (کہ یوسف زندہ ہے)''۔

یہاں بھی مادہ ''ض ل ل'' ہی ہے۔یعقوب علیہ السلام کے خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے اس قول کو پڑھنے کے بعد بھی کیا ہم میں اتنا حوصلہ ہے کہ ''ض ل ل'' کے معنی محض ''گمراہی، بھٹکا ہوا، گم کردہ راہ'' سمجھیں؟ یہ کیسی ''گمراہی'' ہے کہ قافلہ مصر سے محض یوسف علیہ السلام کی قمیض لے کر چلے اور میلوں دور دوسرے شہر میں بیٹھے یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کی خوشبو آنے لگے؟یعقوب علیہ السلام کے اس مہکتے ہوئے قول ہی کی بنیاد پر (موازنے اور تعصب کی بناء پر نہیں) میں نے مولانا رضا احمد بریلوی صاحب کے اس ترجمے کو خوبصورت کہا تھا ''اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی راہ دی''۔

سبحان اللہ! قربتوں کے انتہائی قریب مقام تک کی راہ کہ عرش معلیٰ کو اپنے ہاتھوں سے تھام لیا۔محبت کا جواب محبت ہے۔اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں کو ادب سے ہماری جھکی نگاہوں کے ساتھ ہر لمحہ سلام پہنچے۔دانستہ غفلت وہ ہے جب انسان خبردار کئے جانے کے باوجود محض ضد اور ہٹ دھرمی سے اپنے نکتہ نظر کے ساتھ بندھا رہے اور اسے گمراہی اور راہ سے بھٹکنا کہتے ہیں اور یہ عربی مادہ ''ض ل ل'' کی منتہا ہے اور راہ ہدایت کی ضد۔گمراہی دانستہ فعل و عمل ہے۔

یارب! آپ کا ہر فرمان ناقابل تردید حقیقت ہے۔میں اپنے بارے میں تسلیم کرتا ہوں کہ آپ نے سچ فرمایا اگرچہ میں ان میں نہیں جن کے متعلق ارشاد فرمایا:

وَمَا قَدَرُواْ ٱللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِۦٓ

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے مطلق مقام و مرتبہ کا احساس وادراک اور احترام اس طرح نہیں کیا جیسا کہ ان کی عظمت و کبریائی کا استحقاق ہے۔(حوالہ الانعام۔۹۱؛الحج۔۷۴؛الزمر۔۶۷)

یارب! آپ سچ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کی وہ قدر نہیں کی جتنی ان کی قدر کرنے کا حق ہے۔یارب! تو ہمیں معاف فرما! تیری قدر کا ادراک تو تب کرتے اگر ہم تیری اس عظیم تخلیق، عظیم بندے کے مقام و مرتبہ کو سمجھ پاتے۔آپ تو ان کی عمر کی قسم اٹھاتے ہیں۔لَعَمْرُكَ ''تیری عمر، زندگی کی قسم''(حوالہ الحجر۔۷۲)۔اور ایک ہم ہیں کہ ان کی عمر کو خانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔یارب! تو معاف فرما! تیرے اس احسان کی ہم قدر کرتے ہیں اور شکر گزار ہیں کہ تو نے انہیں مبعوث فرمایا اور گواہی دیتے ہیں کہ ان کا ہر لمحہ قرءانِ مجید کے نزول سے قبل اور بعد میں بھی صرف تیرے لئے ہے اگرچہ تیری اور رسولِ کریم ﷺ کی گواہی کے بعد کسی گواہی کی کوئی اہمیت نہیں۔آپ جناب کے بدرجہ اتم لطیف ہونے کا احساس قرءان مجید میں آقائے نامدار ﷺ کے متعلق پڑھ کر اور یہ جان کر ہوا کہ آپ نے اپنے کلام کو قولِ رسولِ کریم ﷺ قرار دیا ہے۔کیا لطیف انداز ہے یہ بتانے کا کہ قرءان مجید کے نزول سے قبل جیتے جاگتے پیکرِ قرءان کو نبیّ امیّ کے روپ میں لوگوں کے مابین موجود رکھا تھا۔آقائے نامدار ﷺ پر درود و سلام ہے ہر لمحہ صبح و شام۔